انتخابِ آتش

سید مرتضیٰ حسین فاضل

کتاب منزل، ایجوکیشنل پبلشرز کشمیری بازار، لاہور

آتش

آتش

حالات

تنقید

انتخاب

واسوخت

از

مرتضیٰ حسین فاضل

کتاب منزل - لاہور

۵

پروفیسر آل احمد سرور

" آتش کی شاعری پر لکھنؤ سے زیادہ خود ان کی شخصیت کا پرتو پڑا ہے۔ لکھنؤ میں اور بھی بہت سے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے عشقیہ شاعری کی ہے لیکن وہ صرف عاشقانہ خیالات تک محدود رہ گئے ہیں۔

آتش کے یہاں نفسیاتی گہرائی کے ساتھ پھیلنے اور چھا جانے کی جو کیفیت ملتی ہے وہ اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی، جب تک ان کی بصیرت ان کا وجدان اور ان کا جمالیاتی احساس اس قدر وسیع نہ ہوتا۔ یہ باتیں صرف ان کی شخصیت کا جزو ہیں۔"

تعارف

دہلی کے غالبؔ، مومنؔ اور لکھنؤ کے آتشؔ و ناسخؔ کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ چاروں معاصر اپنے زمانے کے نامور شاعر اور تاریخ ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ اتفاق یہ ہے غالب و ناسخ، مومن و آتش میں بعض مشابہتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

آتش لکھنؤ اسکول کے پہلے فن کار اور ادب کے نئے تاریخی موڑ کا بڑا مینارہ ہیں، جن کا فن جاذب نگاہ اور کردار بہت حسین ہے۔ آب حیات اور آب بقا نے ان کے سوانحی حالات اور بعض مضمون نگاروں نے ان کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے۔

زیر نظر سطور میں مذکورہ ماخذ کو اسی حد تک استعمال کیا گیا ہے۔ کہ ان سے نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ فقط ان کی باتوں کو دہرانا مقصود نہیں۔ بعض نئے ماخذ (کی مفید باتیں) جو ان کتابوں کے وقت ناپید تھے ان کی روشنی میں مضمون کو تیار کیا گیا اور کوشش کی ہے کہ جس طرح کلام آتش کے انتخاب سے ان کے فن کا صحیح تعارف ہو سکے۔ اسی طرح مقدمے سے شخصیت پر روشنی پڑ سکے۔

آتش کا خاندان، وطن اور ماحول

مصحفی نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے :-

سلسلہ نسبش بخواجہ عبداللہ احرار منتہی می شود۔ بزرگانش در بغداد توطن داشتند۔ بعد از جلائے وطن قایم در شاہ جہان آباد کہ

"بہ قلعہ کہنہ" شہرت دارد استقامت گرفتند" ص ۲

خواجہ علی بخش شکیل و وجیہہ، صوفی شخص تھے۔ پر اپنے قلعے کے خواجہ زادوں میں پیری مریدی تو تھی ہی یہ بھی اپنے خاندانی مسلک پر چلے۔

فیض آباد کی کشش نے خواجہ صاحب کو کھینچ بلایا۔ اور یہیں محلہ "مغل پورہ" میں آبسے۔ مگر ان کی زندگی میں وہی گمنامی رہی جو پہلے تھی۔ شاید انھوں نے کسی امیر کبیر سے وابستگی یا ہنگامہ آفریں زندگی کو پسند نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجاع الدولہ نے شمالی ہند اور اس طرف کی بڑھتی طاقتوں کا مقابلہ کر رکھا تھا۔ فیض آباد میں ہر طرف فوجی سپاہی، دلی کے بانکے اور عوام کی شورہ پشتی کے ساتھ ساتھ رامش و رنگ کے ہنگامے بھی گرم تھے۔ علم دوست امیروں کے یہاں مباحثے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ مسجدوں میں وعظ اور مدرسوں میں درس و تدریس کا بازار گرم تھا۔

ولادت و تربیت اسی زمانے میں خواجہ حیدر علی آتش کی ولادت ہوئی۔ تاریخ ولادت تو کسی تذکرے میں نہیں ملتی البتہ آب بقا میں یہ ہے:

"جناب عالی (شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خان خاناں کی پوتی سے کی جس میں چھبیس لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۷ء (۱۱۸۱ھ)[1] ابھی یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ

---

[1] اس حساب سے خواجہ کی عمر میر کے انتقال (۱۲۲۵ھ) کے وقت ۴۴ برس ہوتی ہے ریاض الفصحا کی ابتدا تصنیف ۱۲۲۱ھ کے وقت چالیس سال کی۔ جو آگے آنے والے بیانات کے خلاف ہے۔ م۔ ح

خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔" ص۱۲

عشرت ہی نے لکھا ہے کہ خواجہ میر صاحب کے انتقال کے وقت اکتالیس برس کے تھے، اور تسلیم نے جب انھیں دیکھا تو ستّر برس اور خواجہ رکن الدین نے جب دیکھا تو اسّی کے قریب کا اندازہ لگایا تھا۔ مصحفی کہتے ہیں: "حالا کہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ" تذکرہ ریاض الفصحا چونکہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور آتش کا ذکر آغاز ہی میں ہے۔ اس لیے سنہ ۱۱۹۲ھ سال ولادت ہوتا ہے۔ اور تسلیم کے اندازے سے بھی یہی ٹھیک ہے۔ اور خواجہ رکن الدین کے اندازے سے بھی اسی کے لگ بھگ ہے۔ اس اعتبار سے تین سنہ معین ہوئے۔ سنہ ۱۱۸۱ھ اور بقول مصحفی و تسلیم سنہ ۱۱۹۲ھ اور بقول احسان دانش سنہ ۱۱۸۰ھ (۱۸۶۴ءلہ) تو بترتیب مذکور سنہ ۱۲۶۳ھ میں تراسی، اکہتر یا آٹھتر یا پچاسی برس بنتے ہیں۔

چونکہ دیکھنے والوں نے اسّی سے زیادہ کا اندازہ نہیں لگایا اس لیے ۸۱، اور ۱۱۷۹ھ (یعنی ۱۷۶۶، ۱۷۶۴ء) والی روایت تو قابل بحث نہیں البتہ مصحفی اور عشرت کا بیان (۹۲ اور ۱۱۸۶ھ) توجہ طلب ہے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ " جوان وجیہہ" ہے اور " ابتداء موزونی طبع سے مجھے کلام دکھاتے ہیں۔" عشرت کہتے ہیں کہ " میر کے انتقال کے وقت اکتالیس برس کے تھے۔ اور یہ دونوں باتیں جوڑ نہیں کھاتیں۔ کیونکہ اگر پہلی بات مانی جائے تو ۱۲۲۵ (سنہ وفات میر) میں تینتیس برس کے ہوتے ہیں

لہ بہار سخن صہ۴

اور یہ ماننا پڑے گا کہ تسلیم نے وقت وفات دیکھا تھا۔

اور اگر عشرت کی بات ٹھیک ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے تو سال ابتدائے تالیف ریاض الفصحا کے وقت ان کی عمر سینتیس سال اور وفات میر (۱۲۲۵ھ میں) اکتالیس اور ۱۲۶۳ھ میں اناسی برس کے تھے جیسا کہ خواجہ رکن الدین کا اندازہ ہے۔

اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان ولادت ماننا چاہیے اور دو تین سال کا فرق یوں نکل جائے کہ مصحفی نے ۱۲۲۱ھ سے اور تسلیم نے آتش کے مرنے سے دو چار سال پہلے دیکھا اور عمر کا اندازہ لگایا کیونکہ خواجہ رکن الدین تو کہتے ہیں کہ ان کے دیکھنے کے آٹھ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ رہا مصحفی کا قول تو اس میں ایک تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں "حالا" سے مراد وقت تحریر حال ہوتا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے آتش کے کئی ایسے شاگرد بتائے ہیں جن کی عمر خواجہ سے بڑی تھی جیسے شائق جو تیس سال کے اور انفعل جو تیس سے زیادہ اور ماہتب جو سینتیس برس کے تھے۔

بہر حال بچپنے میں تکمیل تعلیم و جوانی سے پہلے باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا، فوج کے لڑکوں اور سپاہی زادوں کی صحبت میں بانکپن اور شورہ پشتی پیدا ہو گئی۔ بانکوں اور سپاہیوں کی قدر ہوتی تھی اس لیے مغل بچوں کی صحبت سے شمشیر زنی کا شوق ہوا ہاتھ ہلکا اور طبیعت نڈر تھی، ہاتھ صاف کرنے لگے۔ بے شمار چوٹیں کھائیں، ہزاروں ٹانکے لگوائے اور تلوریے مشہور ہو گئے۔

اس زمانے میں نواب مرزا محمد تقی ترقی فیض آباد کے نامور رئیس اور اس جوہر کے قدر دان تھے، انھوں نے ناسخ کی طرح آتش کو بھی نوکر رکھ لیا[1]۔ ان کے یہاں علم و ادب کا چرچا تھا، آئے دن مشاعرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے، قاسم نے مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ "سخنش درد آلود و رنگین، فکرش بغایت خوب و دل نشیں، گویند کہ در فیض آباد طرح مراختہ می انداخت و بہ مرکس بزرگانہ می ساخت" اسی لیے ان کے مشاعروں میں میر و جرأت وغیرہ کے حال میں ایک مشاعرے کا ذکر یوں کیا ہے:

ایک روز انھیں کے مشاعرے میں تمام اکابر جمع تھے۔ جرأت نے غزل پڑھی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ میر صاحب بیٹھے تھے۔ غزل ختم کرکے جرأت نے جرأت کی اور میر کے پاس پہنچ کر داد چاہی۔ میر صاحب نے دو تین مرتبہ ٹالا مگر ان کا اصرار بڑھتا گیا، آخر کہنے لگے کہ[2] "بھئی اس کی ضد ہے کہ میں اپنی رائے ضرور دوں تو سنو" "کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹا (کذا۔ چاٹی آب حیات) کہہ لیا کرو" کیا بعید ہے کہ

---

[1] گل رعنا اور آب بقا میں غلطی سے میر لکھا گیا ہے مجموعۂ نغز و آب حیات خمخانۂ جاوید میں مرزا ہی ہے۔

[2] آب بقا ص ۱۲ گل رعنا ص ۲۵۱

[3] "ہر گاہ کہ ایشاں بدیں جدہ کہ می پسند نا چار می گویم و ایں الفاظ بہ شدی بزبان نخوۃ توامان دسے گزشت۔

آتش نے یہیں رہ کر کچھ کہنا سیکھ لیا ہوگا لکھنو پہنچے تو آغاز شباب تھا،
یہاں وہ بلنکے جوان اور تلوریوں کا ماحول اس زور شور کے اکھاڑے کہاں؟
اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو علمی چرچے پسند کرتے یا عیاشی، پیسے اتنے
تھے نہیں کہ شریف آوارہ گرد بنتے۔ پھر فیض آباد کے محسن نے کچھ علمی ذوق
دے دیا تھا۔ ساتھی بھی شاعر مزاج تھا لہٰذا مصحفی کی محفل پسند آئی۔
مصحفی اپنے شاگردوں کو ادب پڑھایا کرتے تھے[۵۱]۔ اس لیے آتش نے بھی
ضرورت بھر پڑھا اور مطالعہ بھی کیا، لیکن وارفتہ مزاجی نے جم کر قابلیت
نہ بڑھانے دی۔

مصحفی نے لکھا ہے کہ :

" از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی
ہر دو می کرد۔ اما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود، و آں روزہا کلام
منظوم خود را بہ نظر فقیر می گزرانید، و بہ رافت طبعش ازاں ظہور می داد "
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے کافی واقفیت تھی، آزاد
کہتے ہیں کہ " کافیہ کو کافی سمجھا " اور کافیہ تک کا نصاب تعلیم متوسط عربی داں
کے لیے تھا۔ اس کے ساتھ صرف، منطق و ادب و عروض وغیرہ[۵۲] بھی ہوتا تھا۔
اس کے معنے یہ ہیں کہ متوسط درجے میں اچھی خاصی تعلیم تھی مگر کمال ناسخ

---

[۵۱] مولوی عبدالقادر رام پوری نے لکھا ہے : یک روز ملاقات تفصیلی بیان مصحفی شد،
کہ بخانۂ آں بزرگوار رفتم، بہ پیشتر مردم درس " گل گشتی " میر نجات دادے، و اصلاح اشعار
اکثرے ہم می کرد " (حاشیہ دستور الفصاحت از مولانا عرشی صـ۹۳)

[۵۲] تاریخ ادب، عسکری صـ۱۳۲۔

ہی کو تھا چنانچہ زند وغیرہ عروض میں، انہیں سے رجوع کرتے تھے[۱۵]۔ شہرت خداداد، شاگردوں کی زیادتی اور طبیعت کی بے باکی نے اُستاد سے چھٹادی۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ :-

خدا جانے بنیادِ اختلاف کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ مگر جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اس کی حکایت یہ سُنی کہ کسی مشاعرے کی طرح تھی "دہن بگڑا" یا "سخن بگڑا" سب کے ساتھ خواجہ نے بھی غزل کہی اور "کفن" و "دہن" کے قافیے اُستاد کو سُنا کر کہا۔ اس ردیف قافیے میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑے۔ استاد کو یہ بات ناگوار گذری ہو گی کہ ایک نومشق لڑکے کی غزل کو توجہ سے بنایا اور یہ دو قافیے یوں لکھے۔

لکھا ہے خاک کوئے یار ت اے دیدۂ گریاں
قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا

نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اترے
شبیہہ یار کھنچوائی کمر بگڑی کہیں دہن بگڑا

مشاعرے میں یہ شعر زیادہ کامیاب ہوئے اور تاڑنے والے تاڑ گئے کہ اُستاد کی اُستادی ہے۔ خواجہ صاحب اسی وقت اُٹھ کر مصحفی کے پاس جا بیٹھے اور غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں[۱۶]۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان قافیوں میں ایسے شعر نکال لیتا۔

---

[۱۵] دیوان ثانی ند ص ۲۰۹
[۱۶] اسی طرح کی ایک بات تمنا نے بھی کہی تھی جسے مصحفی نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے

اس کے بعد سے کشیدگی پیدا ہو گئی ۔

صورت و سیرت | ان کے دیکھنے والوں نے دو تصویریں بنائی ہیں ۔

(۱) ایک خوبصورت و خوشرو، کشیدہ قامت، چھریرا بدن سپاہیانہ آزاد وضع، خاندانی تمغہ قائم رکھنے کے لیے کچھ فقیری بھی لیے ہوئے تھے۔ چار ابرو صاف۔ سر پر ایک زلف اور کبھی محمد شاہی بانکوں کی طرح حیدری چوٹی جس میں سبزی کا طرہ لگا۔ کمر میں تلوار۔ (آب حیات)

یا :- آدھا سر منڈا آدھے پر پٹے کبھی قالب دار، کبھی نکے دار، ٹوپی سر پر۔ کھانڈا باندھتے، اک پٹے جوانوں کی طرح کبھی کبھی بھنگیڑین کی دوکان پر چرس کا بھی ایک دم لگا لیتے۔ اور اگر راستے میں کسی نے مونچھ اونچی کر لی، تو بس آگ ہیں، کھانڈا نکال سامنے۔ "آؤ بھائی پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ ۔"

(۲) آخری عمر میں بڑھاپے کی وجہ ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا جس میں ایک سونے کا چھلا جسے ضرورت کے وقت فاقہ شکنی کے کام لاتے۔ کبھی بالشت بھر کی داڑھی رکھ لی، کبھی مونچھیں بڑھالیں۔ مگر وضع وہی آزادانہ و سپاہیانہ۔ مشاعروں میں بانکے اور شاگرد ساتھ ہوتے تھے کبھی کبھی مستی میں میدانوں اور جنگلوں کی راہ لیتے تھے۔

صفدر مرزا پوری نے لکھا ہے کہ کہیں جا رہے تھے، کسی نے پوچھا خواجہ صاحب کدھر کا قصد ہے؟ فرمایا: "آج مرغ لڑیں گے وہاں جا رہا ہوں۔" اس نے کہا: "مُرغ لڑیں گے یا مَرغ؟" فرمایا، "لکھنے کی بالی میں تو مُرغ ہی ہوتے ہیں، زبانوں پہ مَرغ ہی ہے۔" (حسن خیال صـ۱۴۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرغ بازی سے بھی دلچسپی تھی ۔

مزاج میں سادگی، طبیعت میں استغنا، بے حسد دل، سیدھے سادھے
اور بے پروا آدمی تھے، جو ملتا خرچ کر دیتے۔ ملاقات میں سب کو ایک نظر
سے دیکھتے، ہاں امیروں سے ذرا شان کی لیتے تھے۔

بود و باش | نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے مادھو لال کی چڑھائی
کے آثار میں ایک کچا مکان (جس میں باغ بھی تھا) خرید لیا تھا) اسی میں
بیٹھک کے لیے دیواریں کھنچوا کر ایک چھپر ڈال لیا تھا (جو لکھنؤ کے
متوسط الحال سادہ مزاج شریفوں کا طریقہ تھا)، اسی میں نرکل کی چٹائیوں
کے فرش پر شاگردوں اور دوستوں سے ملاقات ہوتی تھی آخر میں ضعف و
بیماری و مرض کی وجہ سے ایک پلنگ آگیا تھا اس پر بیٹھتے، لیٹتے اور
وارث علی ان کے رفیق خاص بھنگ گھوٹتے تھے، ایک بھیج بھچا ساحقہ
خود بھی پیتے اور آنے والوں کی خدمت میں بھی پیش کرتے تھے۔

سو یا اسّی روپے درایت یا ولی عہد (واجد علی شاہ) سے ملتے،
پچیس روپے جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد خاں رسالدار دیتے تھے،
رند اور خلیل کی طرح دوسرے شاگرد بھی کچھ نہ کچھ ہدیۃً پیش کرتے
رہتے تھے۔ مگر سب ضیافت میں اڑا دیتے، کیونکہ تنہا خوری کے
عادی اور فاقوں سے گھبراتے نہ تھے۔ ان کا شعر ہے ؎

نعمت نقد تو بھی خو نہیں تنہا خوری
بانٹ کھاتا ہوں جو ہوتے ہیں میسر ٹکڑے
آتش جو چاہیے پاسِ توکل کو محکمی
جو صبح کو ملے نہ رہے شام کے لیے

ایک شریف خاندان میں شادی کر لی تھی۔ آمدنی میں سے

پندرہ روپے گھر میں دیتے تھے۔ جس سے بیگم نے گھر سنبھال رکھا تھا۔
دروازے پر ایک گھوڑا بھی بندھا تھا۔

شاگرد تو بہت سے تھے جن میں ۱۔ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ (م ۱۲۹۰) ۲۔ میر وزیر علی صباؔ (گلستانِ بے خزاں) ۳۔ لالہ سیوا رام شائقؔ۔ ۴۔ صدر الدین صدرؔ ۵۔ احسن یار خاں انسؔ۔ ۶۔ جیالال گلشنؔ، ۷۔ میر ناصر مقتول۔ ۱۲۳۰ھ۔ ۸۔ شیخ ہدایت حیدر واجبؔ (ریاض الفصحا) ۹۔ دوست علی خلیلؔ۔ ۱۰۔ سیّد محمد اکبر قدسیؔ۔ ۱۱۔ جنوںؔ داماد روشن الدولہ۔ ۱۲۔ محمد علی خاں حزیںؔ۔ ۱۳۔ سیّد محمد خاں رندؔ۔ ۱۴۔ حزیںؔ میر علی حسین۔ ۱۵۔ حسینؔ صاحبزادہ غلام حسین رامپوری۔ ۱۶۔ منشی سیّد محمد عبد البصیر۔ ۱۷۔ مرزا عنایت علی ماہؔ برادر حاتم علی مہرؔ۔ ۱۸۔ الف شاہ جولانؔ (م ۱۲۶۴ھ) ۱۹۔ نواب مرزا شوقؔ (م ۱۸۷۱ء) ۲۰۔ آغا حجو شرفؔ مشہور ہیں۔

لیکن ان سب سے کمال اور فن کے لحاظ سے محبت کرتے تھے۔

حسن خیال میں یہ بھی قصہ ہے کہ:

ایک مشاعرے میں نسیم نے غزل کا مقطع پڑھا:

ہوں معتقد جو آتشِ ہندی کا اے نسیمؔ
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

کسی نے آوازہ کسا "آتش کو کہتے ہیں کہ برہمن پرست ہے"
جو لوگ اُستاد شاگرد کے تعلقات سے واقف تھے منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگے[۱]۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نسیم تھا بھی محبت کے قابل

---

[۱] ص ۱۰۲

اس کی مثنوی "گلزارِ نسیم" آتش کے لیے بھی "فخریہ" ہے۔

میر وزیر علی صبا (م ۱۲۷۱ھ) (جنھیں آتش کا جانشین بنایا گیا[1])۔ ایک غریب آدمی تھے۔ مگر فن میں بڑے اچھے درجے کے مالک تھے۔ رند نے ایک مشاعرہ کے لیے غزل کہی اور اس کا لازمی قافیہ فخریہ لہجے میں سنا کر عرض کیا کہ اسے اب کوئی کیا کہے گا۔ شعر تھا ؎

اگر نی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

خواجہ نے سن کر کہا، ٹھہرو، صبا بھی آتے ہوں گے، کچھ دیر کے بعد صبا آئے تو کہا: سید صاحب مشاعرے کے لیے غزل کہی ہو تو سناؤ: صبا نے تعمیل ارشاد کی اور عرض کیا۔

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر

پھڑک کر داد دی اور نواب صاحب سے کہا دیکھیے یوں کہتے ہیں۔

اسی طرح کیف کی ایک غزل سن کر کہا۔" بھئی اتنی اچھی غزل کے بعد میں تو مشاعرے میں اپنی غزل نہ پڑھوں گا۔

سب شاگرد بھی بہت جدت کرتے اور خیال رکھتے تھے

---

[1] لکھنؤ میں نواب ضوء عالم صاحب کے یہاں میں نے ان کی ایک قدیم قلمی تصویر دیکھی تھی گندمی رنگ، بھرا ہوا چہرہ، قالب دار ٹوپی، گھنی مونچھیں، داڑھی صاف، ہاتھ میں کنٹھا، کوئی چالیس برس کی عمر میں وفات پائی۔

عام دوست احباب محبت سے " خوجی " کہتے تھے۔ توکّل و بے پروائی کا یہ حال کہ اپنے حریف کی شان و شوکت سے متاثر نہ تھے کہ خود بھی وہی نقشہ جماتے، سیدھے بھی اتنے تھے جتنے بانکے۔

آزاد نے میر انیس کی زبانی لکھا ہے کہ :

" ایک دن نماز کا خیال آگیا کسی شاگرد سے کہا بھئی نماز توسکھادو، وہ اتفاقاً سنّی تھے، اپنے طریقے کی نماز سکھادی یہ اسی طرح پڑھنے لگے ایک دن خلیل (جنھوں نے غالب کی مثنوی " کلمات طیبات " کا جواب لکھا تھا) نے دیکھ لیا۔ عرض کی اُستاد آپ کا مذہب کیا ہے؟ کہنے لگے شیعہ، انھوں نے کہا مگر نماز سنّیوں کی؟ فرمایا: بھئی میں کیا جانوں فلاں نے سکھائی تھی اسی طرح پڑھتا تھا، اس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے کیونکہ اپنے مذہب کے لیے خود کہا ہے :

ساغر صاف سے حبّ علی مشرب ہے مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

ایک شاگرد مصائب سے پریشان ہو کر باہر جانے کا ارادہ کرتے تھے، خواجہ کہتے " ارے کہاں جاؤ گے؟ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو، جو خدا دیتا ہے اس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور بنارس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جب اُٹھنے لگے تو پوچھا، کوئی پیغام سلام، کام کاج تو حکم دیں ہنس کر فرمایا، اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا اسلام کہہ دینا! " وہ حیران ہو کر کہنے لگے، کیا یہاں اور وہاں کے خدا الگ الگ ہیں؟ فرمانے لگے، شاید یہاں کا بخیل اور وہاں کا سخی ہو؟

مشاعروں اور ناسخ والوں سے نوک جھونک تو رہتی ہی تھی (آب حیات دیکھیے) مگر مشاعروں میں اکثر آتش ہی کی حیثیت ہوتی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے درباری مشاعرہ کیا، آغا میر مہتمم تھے، سب کو مصرعہ بھیجا مگر خواجہ کو دو ایک

میں پہلے چوبدار شاہی کے ہاتھ دعوت نامہ بھیجا۔
خواجہ یہ دیکھتے بگڑ گئے، گھر میں کہلا بھیجا:
"کچھ شگوں کی روٹی پکا دو، ہم کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔"

دوسرے روز علی الصباح پیدل چل کھڑے ہوئے راستے میں مرزا محمد تقی حیدر اپنی کوٹھی سنہرے برج میں بیٹھے سیر کر رہے تھے اُستاد کی وضع قطع اور انداز رفتار دیکھ کر آدمی بھیجا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب سے کہنا کہ سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ باہر جا رہے ہیں۔" یہ سُننا تھا کہ نواب بوچے پر سوار ہو اور فوراً راستہ روک کھڑے ہو گئے۔ قصّہ پوچھا اور کہا اُستاد آپ کو اس کی کیا پروا ہے آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچ سو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے۔ یہ کس کام آئے گا۔ آپ دیکھ لیجیے گا اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ مرزا صاحب دس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے۔ ان کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے اور شام تک غزل کہا کیے۔

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی "حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں۔ اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو آتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گزارش یہ ہے کہ خاص گڑگڑی مرحمت ہو" یہ عرضداشت محل کے اندر پیش ہوئی اگرچہ دربار میں سوائے بادشاہ کے یہ حق کسی کو نہ تھا، مگر منظوری دی گئی۔

شام تک مشاعرے کی دُھوم ہو چکی تھی۔ نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی خاں، نواب نصرت یار خاں، رند، خلیل اور دوسرے شاگردانِ آتش مرزا تقی صاحب کے یہاں جمع ہوئے۔ جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ ناسخ اپنے شاگردوں سمیت مشاعرے میں پہنچ گئے۔ تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار کمر سے لگائی ایک تہمد باندھے آزادانہ وضع سے نکلے خادم نواب سر پر چھتر لگائے رنگا رنگ کے شاگردوں اور نواب کا رسالہ جلو میں لیے مرنے کٹنے پر تیار ہو مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔

بادشاہ صدرِ محفل میں اراکینِ سلطنت با ادب ایستادہ آگے چلمن پڑی ہوئی بارہ دری کی بغل میں داہنی طرف ناسخ اور شاگرد فرد کش اور بایاں رُخ خواجہ کے شاگردوں کے لیے خالی۔ درمیانی حصّے میں اعلیٰ حضرت کے سامنے کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔

خواجہ اسی انداز سے آئے اور حضور کے سامنے والے حصّے میں چوبدار کو ڈانٹ بتا کر کورنش بجا لائے اور بیٹھتے ہی عرض کی۔

"حضور۔ وعدہ پورا ہو!"

بادشاہ نے گڑگڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

عرض کی۔ اجازت ہو تو غزل عرض کروں۔ جب اجازت مل گئی، تو دھوئیں پار کر دیے، ہر مشاعرے کی طرح سے یہاں بھی حریف سے بازی لے گئے۔ ختمِ مشاعرہ پر دوہرا خلعت ملا۔ جو باادب واپس کر دیا۔ کہ حقّہ ملنا ہی خادم کے لیے بڑا انعام تھا۔

عام طور سے مشاعروں میں یہی رنگ رہتا تھا، مگر ہمیشہ غزل کی

کامیابی ناسخ کے مقابلے میں رنگ لاتی تھی۔

سفر صفدر مرزا پوری نے لکھا ہے کہ :

ایک دفعہ الہ آباد میں ایک معرکۃ الآرا مشاعرہ تھا، شیخ ناسخ اور خواجہ کے شاگردوں کا ہجوم، ناسخ نے جب یہ شعر پڑھا :

دمِ خنازیر زمیں ہے مدد اسے جوشِ جنوں
آشنا چاک گریبان کفن بھول گئے

تو شاگردوں نے مشاعرہ سر پر اُٹھالیا، کہ قافیہ تو استاد کا ہوگیا۔ آتش نے فوراً میرِ مشاعرہ اعظم علی اعظم کو ایک شعر دیا :

یاد انجام کسے عالمِ اسباب میں ہے
جامہ زیبی پہ اکڑتے تھے کفن بھول گئے

آخر میں جب شمع اعظم کے سامنے آئی تو انھوں نے محفل الٹ دی۔ اس کے باوجود ناسخ کی صحت کا بہت اثر ہوا۔ چیخیں مار مار کر روئے اور شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔

آخری عمر اور وفات منشی قمر کہتے تھے کہ "جب ہم نے دیکھا تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی، گورے دبلے پتلے آدمی تھے۔ سر پر لمبے لمبے بال، جنھیں سمیٹ کر جوڑا باندھ لیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں داڑھی منڈی ہوئی، ایک تہمد آدھی باندھے آدھی اوڑھے بیٹھے تھے۔"

خواجہ محمد بشیر کہتے ہیں : "ہم بہت کم سن تھے صفر (جنوری) کا مہینہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) کا زمانہ، کہ آتش کی بیماری کا شہرہ ہوا خواجہ رکن الدین

لے حسن خیال ص۱۱

کے ساتھ دیکھنے گئے۔ کچا مکان جس میں ایک چھپر کے نیچے چارپائی پر
تقریباً اسی بیاسی برس کا ایک آدمی چاروں ابرو کا صفایا کھلتا رنگ پڑا
تھا۔ شاگرد نرکل کی چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ کمزوری اور مرض کی شدت
یہ تھی کہ بولنا چاہتے تھے۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ کچھ دیر کھڑے رہنے
کے بعد چلے آئے۔ آٹھ دن کے بعد سُنا کہ مرحوم نے انتقال کیا۔
میر دوست علی خلیل نے بڑے اہتمام سے تجہیز و تکفین کے بعد گھر
ہی میں دفن کیا۔ اب نہ گھر ہے نہ نشانِ قبر البتہ ایک ٹیلا سا ہے۔
اور چڑھائی کھلا۔ اور نلے سے بدل چکی ہے۔

دوستوں اور شاگردوں نے تاریخیں کہیں جس میں اشرف کا مادۂ
تاریخ تھا "مرد شاہ سخن" ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء (آب بقا)

اولاد | آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے بعد "بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خورد سال
تھے۔" اور خلیل ان کے خبرگیر رہے، لیکن گل رعنا اور آب بقا میں صرف
ایک لڑکے کا ذکر ہے، عشرت نے لکھا ہے کہ اس لڑکے کا نام **محمد علی**
تھا۔

ایک مرتبہ شاگردوں کو معلوم ہوا کہ خواجہ آج کل خالی ہاتھ ہیں۔
فقیر محمد خاں گویا یہ سُن کر دو ہزار کی دو تھیلیاں لیے حاضر ہوئے۔
دروازہ بند تھا۔ آواز دی، اندر سے آواز آئی — "کون؟" یہ بولے
فقیر! — آتش نے کہا: فقیر کا میرے یہاں کام نہیں، آج خدا مہمان ہے!
دوسرے دن پھر حاضر ہوئے، مشکل سے دروازہ کھولا، ان کا لڑکا بہت
کمسن تھا، اسے کنکوا اڑاتے دیکھ لیا نیچے بلایا: ڈور کنکوا دیکھ کر کہا یہ
کنکوا تو اچھا نہیں، کنی لینا ہوگا، ڈور بھی اچھی نہیں، یہ کہہ کر دو تھیلیاں سامنے
رکھوادیں — "لو بھئی اس کا ڈور کنکوا منگوانا۔"

خواجہ کہنے لگے، "خان صاحب! آپ کو چاہیے تھا اس کو تادیب دیتے کہ ایسے شغلوں سے باز رہتا نہ کہ آپ خود اس فضول شوق میں مدد دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر پانچ روپے نکال کر محمد علی کو دیے، اور کہا، خان صاحب کو سلام کرو۔ اس کی چیز کھانا " باقی روپے واپس کر دیے۔
غذا میں تلی ہوئی مرچیں کھایا کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد بیگم نے انتقال کیا، اور خود نابینا ہو گئے۔ محمد علی نے پڑھ لکھ کر شعر کہنا شروع کیے، جوش تخلص رکھا۔ مشاعروں میں جانے اور عزت پانے لگے۔

جے دیال نے عرض کی اُستاد: بھائی کی شادی کر دیں، خواجہ نے عذر کیا کہ اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں، ہاتھ باندھ کر عرض کی نسبت آپ ٹھہرائیں انتظام ہم کر لیں گے۔ جب مجبور ہو گئے تو شادی ٹھہرائی اور طفیل، جے دیال وغیرہ نے دلآرام کی بارہ دری میں شایان شان انتظام کیا۔

جوش، دولھا بننے تو خواجہ نے رونا شروع کیا، لوگوں نے کہا اُستاد، یہ تو خوشی کا محل ہے آپ روتے ہیں؟ فرمایا:
" ہاں ہاں سچ ہے نہیں جو خوش ہوتی، آنکھیں ہی نہیں کہ میں سہرا دیکھتا۔ روؤں نہ تو کیا کروں۔"

جوش، باپ کے بعد ہی ۱۲۶۲ھ کے ہیضے میں جاں بحق ہو گئے۔

تنقید | آتش کے فن اور ان کے کلام کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں ان کے بارے میں رائے عامہ بھی معلوم کرنا چاہیے اور خود بھی اس رائے کی اصلیت اور اہمیت کا جائزہ بھی لینا ہو گا،

رائے عامہ کے لیے ہم نے آزاد سے پہلے کے تذکروں کو دیکھا تو مصحفی سے پہلے اس موضوع پر کسی اور کی تحریر کا سراغ نہیں لگتا۔ (یوں تو عشرت نے یہاں تک لکھا ہے کہ "میرتقی میرآتش اوران کے کلام کی قدر کرتے تھے۔" اور یہ بعید نہیں اس لیے کہ دونوں میں بڑی حد تک مشابہت بھی ہے)

ریاض الفصحا میں ہے:

موئے الیہ از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو می کرد اما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود، و آں روزہا کلام منظوم خود را بہ نظر غفیری می گزرانید، و برانت طبعش ازاں جلوہ ظہور می داد، حالا کہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ دریائے طبعش بہ جوش و خروش (ص۹) در زبانِ نظم ریختہ کہ آں ہم درمتانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ بر معانیش سبقت بر و جستن دشوار می نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ و چندسال برہمیں و تیرہ رفت و فکر متینش را مانع در پیش نیاید یکے از بے نظیر آں روزگار خواہد شد۔" (ریاض الفصحا)

لہ آتش کا تمام کلام موجود نہیں، فارسی کی طرح بقول آزاد اردو کلام بھی ادھر اُدھر رہا۔ کیونکہ نہ تو ناسخ کی طرح ان کے یہاں کاتبوں کا عملہ تھا، نہ انھیں یہ فکر تھی۔ ایک دیوان ان کی زندگی میں اور دوسرا ان کے بعد (پہلے کے ساتھ) ۱۵ جمادی الاوّل ۱۲۶۱ھ میں علی بخش خاں کے مطبع سے لکھنؤ میں شائع ہُوا ایک واسوخت تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" کریم الدین سے ہم نے نقل کی۔ یہ واسوخت کلیات میں نہیں ہے۔

۲۹ برس کے سن میں فارسی اور اردو کے لیے کامیاب شاعر تھے کہ اُستاد "بے نظیر روزگار" ہونے کی پیشینگوئی کرتا ہے۔

غالب بھی ناسخ کے مقابلے میں خواجہ کو ترجیح دیتے ہیں ایک دوسرے معاصر مولوی کریم الدین نے "گلدستۂ نازنیناں" میں لکھا ہے :

"یہ شاعر شعرائے لکھنؤ سے ہیں، اس شاعر کے اس جگہ استاد مسلم الثبوت ہونے میں کچھ شک نہیں" ص ۲۴۴

یا صابر دہلوی گلستان سخن میں گوہر افشاں ہیں کہ :

"عاشق دل سوختۂ سخن، خواجہ حیدر علی لکھنوی . . . . طوطی خوش بیاں لہجۂ شکرستان سخن، اور بلبل رنگیں نوائے گلشن معنی تھا، مضامین شوخ اس کے الفاظ پاکیزہ میں متمکن جیسے آئینے میں سیماب، اور معانی رنگین اس کی عبارت میں جاگزین جیسے مینا میں شراب۔ نکتہ ہائے برجستہ اور اشارات دور، اور زبان پاکیزہ اور عبارت شستہ اور رنگینی معنی، اور شوخیٔ مضمون اور غرابت تشبیہہ اور تازگی طرز، ایک بزم میں ہنگامہ اور منظر سے چہرہ کشا ہیں۔ باعتبار تخلص کے آتش تھا۔ باعتبار تواضع کے خاک، باعتبار تن کے سُست تھا باعتبار فکر کے چالاک مشق سخن کو کہنہ کر دیا تھا اور طرز سخن کو جدید، طبیعت کو گنجینہ کیا تھا، اور قلم کو کلید دیوان فصاحت بیان اس کا انواع سخن سے مملو ہے اور ہر سخن جان نوازی میں باد مسیحا اور آبِ حیات سے ہم پہلو۔"

صاحب "گلستان بے خزاں" نے صفحہ تیس سے پینتیس تک مدح سرائی و عبارت آرائی[۵] اور اسی شعروں کا انتخاب کیا ہے۔

---

۵ حالات کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

ناسخ کی رائے میں "اشعار ان کے پرمضمون و بامزہ ہوتے ہیں۔"[۱]
"گلشن بے خار" میں شیفتہ نے عام لوگوں سے اختلاف کرتے ہوئے
ناسخ کو ترجیح دی ہے:

"مردم ان دیار . . ہر دو را ہم وزن شمارند و قباحت ایں
تحقیق لا یخفی علی من له حظ من الفهم و مع ذالک در نکوئی
طبعش سخن نیست"[۲]

لیکن کوئی بعید نہیں کہ آخر میں وہ بھی مرزا غالب کے ہم خیال ہوکر
آتش کے تیز تر نشتروں سے متاثر ہو گئے ہوں۔

ہماری رائے میں بھی وہ بڑے شاعر تھے اور اس کے ثبوت میں
آتش کا نفسیاتی مطالعہ، ان کے سوانحی حالات کی روشنی میں پیش کی گئی ہے
جس سے ان کے اخلاق، صفات، تصوّف و سادگی کے پورے خد و خال
نظر آتے ہیں۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی نفسیاتی
اور رچی بسی ہوئی حس آزادی، سادگی اور گداز نے ان کو غزل گو اور
واسوخت نویس سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور اس میں وہ ماہر فن کار اور
حساس شاعر کی طرح ہمہ گیری کے مالک ہیں۔ ان کی بلند خیالی اور صنائع و
بدائع کا استعمال صحت مندانہ، مشاہدے میں نزاکت اور عظمت ہے۔

---

[۱] ص ۵ سخن شعرا

[۲] ص ۰

[۳] یعنے لکھنؤ والے آتش کو ناسخ کے برابر کا شاعر مانتے ہیں حالانکہ یہ بدمذاقی
اور ناسمجھی کی بات ہے، ناسخ کا کیا کہنا۔ لیکن یہ بھی برے نہیں۔

تصوّرات میں اعتدال وشعریت ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ان باتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

عرصۂ محشر میں جاتے ہی جہنّم میں پڑا
اور اُلٹے یاں ارادہ تھا مجھے فریاد کا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو
گلِ تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

کاٹ کر پر مطمئن صیّاد بے پروا نہ ہو
رُوحِ بلبل کی ارادہ رکھتی ہے پرواز کا

دن کو تو چین لینے دے اے گردشِ فلک
کافی ہے مجھ کو گردشِ ساغر تمام رات

ان کے نزدیک شعر و حسن میں ایک رشتہ ہے جسے محسوس کیا جاتا ہے، مگر سمجھایا نہیں جاسکتا، آتش سے پہلے یہ تصوّر اس شدّت کے ساتھ کہیں ملتا۔

تری ابروے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی اُستاد شاعر کی یہ بیت عاشقانہ ہے

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصوّر پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

آتش کو حُسن کے قتل کیا اس نے اس لیے
ہوتی ہے قدر شعر بلند انتخاب سے

شاعر پسند حسن پُر آشوب ہے ترا
دیوان روزگار کا تو انتخاب ہے

آزاد کے بعد تذکرہ و تنقید لکھنے والوں کے پہلے طبقے یعنی
شبلی کے پیروؤں نے ان کے یہاں سلاست، مستی، تصوف، صحتِ
زبان، اور واردات عشقیہ بیان کرنے کی خوبیاں تلاش کی ہیں۔ کچھ لوگوں
نے ان کے پہلو دار شعر بھی نکالے ہیں جیسے

نکالا چاہیے اسے غوّاص تو جلد اب نکال اس کو
خدا جانے کہ کیا پھونکے صدف کے گوش میں دریا

مری ضد سے ہوا ہے مہرباں دوست
مرے احساں ہیں دشمن پر ہزاروں

نالۂ بلبلِ شیدا میں اگر ہے تاثیر
دستِ صیاد میں گل چیں کا گریباں ہوگا

لیکن یہ خصوصیات اضافی ہیں ان کا فن اکتسابی نہ ہونے کی وجہ
سے ان مقامات پر نمایاں نہیں ہوتا مان کے یہاں تو ایک قسم کی تڑپ
اور اُڑان ہے اور یہ اُڑان ان کی طینت کا جز اور اصل فطرت ہے
چاہے اسے معرفت و اخلاق سمجھیں یا بیان واردات اور محاکات
جذبات۔

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ، وہ طلائی کا

پوری غزل اور اس طرح کی دوسری عارفانہ چیزیں دیکھیں معلوم
ہوتا ہے۔ جیسے زیرلب اسرار بیان کیے جا رہے ہیں، حال کا رنگ

اور شور و نعرہ زنی کا زور نہیں ملے گا۔ مگر یہ سبک اور پُر لطف انداز
دل میں اُترتا اور کلیجے کو برماتا ہے۔ ذرا دیکھیے تو کہ

کیا داد خواہ ہو کوئی اس کے قتیل کا
عاشق کے خوں کو حکم ہے آبِ سبیل کا

نہ کرتی عقل اگر ہفت آسماں کی سیر
کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

تیرا نیاز مند جو اے نازنیں نہیں
دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانا کہیں نہیں

تصنّع اور تکلف نام کو نہیں بلکہ فطرت کی طرح سادہ مگر پرکار ہیں۔
اگرچہ ان کی رائے ہے کہ

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

مگر خود یہ غزل بھی اس نظریہ کی عملی تردید کرتی ہے۔ پوری غزل
پڑھ ڈالیے کیا مجال جو کہیں بھی "مرصع پن" نظر آئے۔ ہاں آب و تاب
تڑپ اور پرواز ہے۔

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

یہ اشارہ ہم سے ہے ان کی نگاہِ ناز کا
دیکھ لو تیرِ قضا ہوتا ہے اس انداز کا

رُوح قالب سے جُدا کرتا ہے قالب رُوح سے
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ تیرے ناز کا
کاٹ کر پر مطمئن صیّاد بے پروا نہ ہو
رُوح بلبل کی ارادہ رکھتی ہے پرواز کا

یہ بلند آہنگی اور چھا جانے کی قوت آتش کے کلام میں رچی بسی ہوئی چیز ہے اور عشقیہ معاملات و واردات میں بھی یہی رنگ ہے، ان کا دل جذبات کی دُنیا ہے جس میں وہ خود رہتے ہیں، اس میں ویرانے کے بجائے آبادی اور آبادی میں انسانیت اور زہنِ آدمیت ہے، ان کا یہ طریقہ ہے کہ جو کہتے ہیں صاف اور وہی جو ہوسکتا ہے یا ہوا ہے۔ مثلاً

تصوّر سے کسی کے مَیں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی رو برو برسوں
ہُوا مہمان آکر رات بھر وہ شمع رو برسوں
رہا روشن مرے گھر کا چراغ آرزو برسوں
برابر جان کے رکھّا ہے اس کو مرتے مرتے تک
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں
بہار گل گئے پر بھی نہ سودا جائے گا اپنا
ہمارا پیرہن پھوٹ پھوٹ کے ہووے گا رفو برسوں
دیا ہے حکم تب پیرِ مغاں نے سجدۂ خم کا
کیا ہے جب شراب ناب سے ہم نے وضو برسوں
اگر مَیں خاک بھی ہوں گا تو آتش گرد باد آسا

رکھے گی مجھ کو سرگشتہ کسی کی جستجو برسوں

انشا نے جس رنگ پر روغن چڑھایا اور ناسخ نے جسے شعر بنایا تھا اس کے مقابلے میں آتش "نئے نقشے" اور "نرالی صورتیں" تو ایجاد کرتے ہیں۔ مگر ان میں اس وضع کی شاعری کے بجائے مصوّری کرتے ہیں[1]۔ جس میں عام انسانی جذبات کو متحرک شکل میں پیش کرکے فن کی بڑائی اور تخیّل کی وسعت ثابت کرکے دوسروں کی پیشانی جھکا دیتے ہیں۔

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں
دُعائے مغفرت میرے لیے جلاد کرتے ہیں

دوست ہی جب دشمن جاں ہو تو کیا معلوم ہو
آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو

شکارگاہ جہاں میں عزیز ہر دل تھا
بچا جو باز سے میں طعمۂ عقاب ہُوا

بنایا جادۂ رہ مجھ کو خاکساری نے
پھرا جو مجھ سے زمانے میں وہ خراب ہُوا

نہ کھایا ہم نے کڑے پن سے زخمِ تیغ کرم
میں اپنے جوہرِ ذاتی سے غرقِ آہن تھا

یہ "کڑاپن" اور احساس جوہرِ ذاتی ہی نے انھیں اخلاق وکردار

---

[1] یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں — آتش

میں برتری خیالات و تصورات میں پاکیزگی بخشتی ہے۔

کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش
درونِ صاف دیا پاک اعتقاد کیا

اہل عالم سے ہمیشہ آتش ایذائیں ہوئیں
مردم دُنیا نمک تھے میں دلِ صد پارہ تھا

توڑتا پاؤں کو جو تخت کی خواہش کرتے   کاٹتا سر کو اگر مائل افسر ہوتا

حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ

اس قدر اہل جہاں کو ہے محبت زر سے   پیٹ میں مارتے سونے کا جو خنجر ہوتا

میں اس قسم کی مثالیں دے کر بات بڑھانا نہیں چاہتا کیونکہ یہ انتخاب اور ان کا دیوان گواہ ہے کہ ان کا مزاج عاشقانہ، اور ان کی طبیعت والہانہ ہے، ان کا رنگ وہی ہے جو ان کا کلام ہے، یقیناً وہ دورِ میر کے شاعر، مصحفی کے شاگرد اور ناسخ کے حریف ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ان کا اسلوب انفرادی اور بلند، گہرا اور بقول خود "تہہ دار" ہے۔ مگر یہ تہہ داری بیدل، غالب یا ظہوری کے بجائے حافظ کی طرح ہے ورنہ ناسخ کے رنگ میں تہہ داری آتش کے بس کی بات نہ تھی۔ مقابلے میں دعوے کرنا اور بات ہے۔ آپ دیکھیں کہ یہاں وہ کیسے نظر آتے ہیں

گیسوؤں کا ترے سودا شعرا رکھتے ہیں
یہی باعث ہے جو یہ فکر رسا رکھتے ہیں

یہ ۲۲ یا بائیس شعروں کی غزل ہے اور ناسخ کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے اسی کے آخری شعر میں کہتے ہیں۔

اپنے ہر شعر میں ہے معنیٔ تہ دار آتش   وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

اسی کا ایک شعر ملاحظہ ہو کہ :

دہن یار کو ہم تو نہ کہیں جوہر فرد
منطقی اس میں جو حجت کریں جا رکھتے ہیں

غولیت کی روح عشقیہ تڑپ اور جذبات کی واقعیت کے ساتھ ساتھ جمالیات کی صحیح پرکھ ہے۔ آتش اس سلسلے میں سب سے زیادہ صحت مندانہ تصورات رکھتے ہیں، وہ اصطلاحات کی حقیقت سے واقف ہیں اور ان کی رمزیت کو زیادہ گہرا نہیں کرتے خصوصاً مسلسل غزلوں میں تو ایسی لے آگئی ہے جو ہمیں مستقبل کے باغی غزل گویوں سے قریب کر دیتی ہے۔ اس انتخاب کی ابتدائی غزلوں میں اس جائزے کے لیے حسب ذیل مطلعوں کی غزلیں دیکھیے :

(۱) آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

(۲) رات کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

(۳) کس طرح تم سے نہ مانگیں تمھیں انصاف کرو
بوسہ لینے کا سزاوار دہن کس کا ہے

(۴) تیری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا

چونکہ ان کا عشق واقعی، اور حسیات انسانی ہیں اس لیے وہ روایتی معشوق کے ناز و انداز کے سامنے کبھی کبھی اپنا تیکھاپن بھی دکھاتے ہیں اور یہی لے بڑھ کر معتدل وارفتہ

کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن اس میں نہ ہوس پرستی کی بو ہے نہ آداب عشق کی خلاف ورزی۔ اس کے لیے واسوخت اور اس قسم کی غزلیں دیکھنے کے قابل ہیں جس میں ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔
دو ایک شعر دیکھیے:

احسان مانو حسن خدا داد کا بتو
پتھر تھے تم کو شیشے سے نازک بنا دیا

دھیان اس کاکل مشکیں کا جو آیا مجھ کو
خواب میں آکے سیاہی نے دبایا مجھ کو
نہ سنا تھا سو وہ کانوں نے سنایا مجھ کو
جو نہ دیکھا تھا ان آنکھوں نے دکھایا مجھ کو
شکر صد شکر تعلق نہ ہوا دل کو کہیں
یار و اغیار کے جھگڑے سے چھڑایا دل کو
اس پری رو کے جو گیسو کا ہوا سودائی
میں نے جانا کہ یہ دل پیچ میں لایا مجھ کو
جان بھی نکلی دم نزع تو آسانی سے
کار مشکل کوئی درپیش نہ آیا مجھ کو
جوش وحشت میں جو اکتا کے کبھی اٹھ بھاگا
سینکڑوں کوس غزالوں نے نہ پایا مجھ کو
شام سے پہلوئے خالی نے اک آفت ڈھائی
صبح تک طالع خفتہ نے جگایا مجھ کو
حشر کے روز میں اتنا تو کہوں گا آتش
ان بری رویوں نے دیوانہ بنایا مجھ کو

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں کمال ہی کمال ہے۔ عیوب و نقائص نہیں، عیوب ہیں اور کمزوریاں بھی لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ فن اس میں ڈوبتا نہیں، ناپختہ کاری نہیں بلکہ اکثر ان کا اجتہاد ہے۔ مثلاً لوگوں نے ان کے "تلفظ و استعمال پر حرف گیریاں کی ہیں اور اس قسم کی فہرست بنائی ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ غیر محتاط شخص تھے۔ جیسے انھوں نے مُرَغ۔ عَذار، فلاں، بیگم، غش، المنصاف۔ کفارا، مُطَابِعَ وغیرہ کو استعمال کیا ہے۔ لیکن جب تمنا اور یکتا جیسے لوگوں کی رائے کی روشنی میں ان کے جواب دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اس حد کے غلط کار نہ تھے جیسا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے:

اس زمانے کے محققین کا یہ مسلک تھا کہ:

"اردو نام ہے اس زبان کا جس میں پنجابی میواتی برج ... اور فارسی و عربی کلمات اور دوسری زبانوں کے میل جول اور ان کے توڑ پھوڑ سے بنی ہے کہ ان کا جداپن دور ہو جائے۔ اب جو لفظیں اردو والے استعمال کریں ان کا تلفظ عربی تلفظ یا فارسی لہجے کا پابند نہ ہوگا"

مضطر مرزا پوری نے لکھا ہے:

"ایک دفعہ کسی نے کلمہ عذار کا اعتراض کر کہا کہ خواجہ صاحب

ے دستور الفصاحت ص ۴۳

"عذار" بکسر عین ہے! فرمایا کہ: مخرج عین تو فارسی والے ادا کرسکتے ہیں۔ اردو میں تو عین و الف کی ایک ہی آواز ہے، اگر کسی نقاب پوش سے کہا جائے کہ "عذار کھولو" تو وہ یہی سمجھے گا کہ "ازار" کھولو۔ اس لیے اس التباس سے بچنے کے لیے عذار کے عین کو اُردو میں مضموم ہی بولنا مستحسن ہے، مذموم نہیں۔ جیسے فلاں کی فے مفتوح ہے مگر فحش معنے سے بچنے کے لیے مضموم بولنا فصیح ہے[۱]"

ہاں ان کا کلام پورے کا پورا ایک رنگ کا نہیں فقط سادگی اور بے کیفی کے علاوہ ڈھونڈھنے سے بے لطف مضمون آفرینی، غیر ضروری رعایت لفظی، مبتذل تخیل، سوقیانہ معاملات وجذبات، معشوق کے اعضاء و لباس کا نامہذب تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بلکہ آخری دونوں باتیں ناسخ سے زیادہ ہیں۔ مثلاً دو چار شعر دیکھیے:

درد زخم فرقت اتنا خوں رُلاتا ہے مجھے
روزن دیوار بن جاتا ہے مُنہ ناسور کا

اچھا نہیں مقابلہ اس چشم شوخ سے
اِک دن شکست فاش ہے بادام کے لیے

کلیاں آپ گھر کی بھی جو خوش رو کرتے
تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی آتی

خوش خطوں پر جو طبیعت مری آئی ہوتی
مجھ سے وصلی کی طرح پھر نہ جدائی ہوتی

---

[۱] حسن خیال صہ۱۰۱

وحشت میں کعبے کو جو گیا کوئے یار سے
لیتے جنوں سے جامہ احرام کے لیے

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہاں بگڑا

کیا بادہ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

یہ کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے
پی جائیے گا کس کو شربت نہیں ہے کوئی

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی ہے
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

جس نے باندھے ہوئے گاتی تجھے دیکھا بھڑکا
دل ربا شئے تھی مری جان تری گات نہ تھی

اسی رنگ نے آتش کو دورِ نو کا قائد قرار دیا ہے، یعنی نئے دور میں مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ درد آفرینی، جذبات نگاری کرنے والے آتش کے پیرو ہوئے۔ اور فقط خیال بندی اور مذکورہ خصوصیات کے حامل، ناسخ کے۔

ان دونوں گروہوں نے جو لٹریچر پیدا کیا وہ اس قدر جاندار تھا کہ کام آیا۔ آتش اسکول نے گلزارِ نسیم و زہرِ عشق، فریبِ عشق وغیرہ پیش کی اور ناسخ اسکول نے اصلاحِ زبان کی خدمت انجام دے کر لغت تیار کیے اور اصول پر پابند رہنا سکھایا۔ مگر یہاں تو بقول آتش

لکھے گئے بیاضوں میں اشعار انتخاب
رائج دہی ہوئے کہ جو ستے کھرے ہوئے
مرتضےٰ حسین فاضل لکھنوی

ماخذ

۱- **ریاض الفصحا** : از شیخ غلام ہمدانی مصحفی (م ۱۲۴۰ھ) (ضروری)
(طبع اوّل)

۲- **آبِ حیات** : از محمد حسین آزاد (م ۱۳۲۸ھ) (بہت زیادہ
(طبع دوازدہم)   اہم ہے) اس سے زیادہ تفصیل کہیں نہیں)

۳- **آبِ بقا** : از خواجہ عبدالرؤف عشرت، بترتیب جعفر علی نشتر
(طبع اوّل)

۴- **مجموعۂ نغز** : از حکیم قدرت اللہ قاسم (م ۱۲۴۶ھ)
(طبع اوّل)

۵- **گلدستۂ نازنیناں** : از کریم الدین پانی پتی
(طبع اوّل ۱۸۴۵ء)

۶- **سراپا سخن** : از محسن علی محسن

۷- **گلشن بے خار** : از مصطفےٰ خاں شیفتہ (م ۱۲۸۶)

۸- **گلستانِ سخن** : از قادر بخش صابر دہلوی

۹- **سخن شعرا** : از عبدالغفور نساخ (م ۱۳۲۸ھ)

۱۰- **خم خانۂ جاوید** : از لالہ سری رام (م ۱۳۴۸ھ)

۱۱- **گل رعنا**: از عبدالحی (م ۱۳۴۱ھ)
۱۲- **قاموس المشاہیر**: از نظامی بدایونی -
۱۳- **تاریخ ادب اردو**: از محمد عسکری (م ۱۹۵۱ء)
(طبع چہارم ۱۹۵۲ء)
۱۴- **حسنِ خیال**: از منشی صفدر علی صفدر مرزاپوری۔ (ضروری)
(طبع اول)
۱۵- **کلیات آتش**: طبع نولکشور اگست ۱۸۷۳ء کان پور
انتخاب میں اسی نسخے کے صفحات کا حوالہ ہے ۔

لکھے گئے بیاضوں میں اشعار انتخاب
رائج وہی ہوئے کہ جو سکے کھرے ہوئے

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعوےٰ ہے خدائی کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ ہے کہ دیوانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

مصرعہ بجا کرتے ہیں عاشق طاقِ ابرو کی پرستاری
یہی محرابِ دیر و کعبہ میں بھی ہم نے خم پایا

ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دُنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصہ ہستی کو کم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کی آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

ہُوا ہرگز نہ خطِ شوق کا سامان درستِ آتش
سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا
کیا داد خواہ ہو کوئی اس کے قتیل کا
عاشق کے خوں کو حکم ہے آبِ سبیل کا
لے جائے خطِ شوق کبوتر غریب کیا
واں جس جگہ مقام نہیں جبرئیل کا
دیکھا تو خار و گل کا مقام ایک شاخ ہے
دل توڑتا نہیں تو عزیز و ذلیل کا

ماضی و حال

آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہدِ مقصود عیاں ہے کہ جو تھا
عالمِ حسن خداداد بتاں ہے کہ جو تھا
ناز و انداز بلائے دل و جاں ہے کہ جو تھا
روز کرتے ہیں شبِ ہجر کو بیداری ہیں
اپنی آنکھوں میں سبک خواب گراں ہے کہ جو تھا
ایک عالم میں ہو ہر چند مسیحا مشہور
نام بیمارے تم کو خفقاں ہے کہ جو تھا
دولت عشق کا گنجینہ وہی سینہ ہے
داغِ دل زخمِ جگر مہرِ نشاں ہے کہ جو تھا
جان کی تسکین کے لیے حالتِ دل کہتے ہیں

بے یقینی کا تری ہم کو گماں ہے کہ جو تھا
کوہ و صحرا و گلستاں میں پھرا کرتا ہے
متلاشی وہ ترا آب رواں ہے کہ جو تھا
پائے خم مستوں کی ہو حق کا جو عالم ہے سو ہے
سر منبر وہی واعظ کا بیاں ہے کہ جو تھا
دین و دُنیا کا طلب گار ہنوز آتش ہے
یہ گدا سائل نقدِ دو جہاں ہے کہ جو تھا

غبار راہ ہو کر چشم مردم میں محل پایا
نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا
برنگ شمع ہم دل سوختوں نے بزم عالم میں
زباں کھولی نہ لیکن بات کرنے کا محل پایا
ہمیشہ جوش گریہ سے رہا پانی میں اے آتش
کبھی تازہ نہ لیکن اپنے دل کا یہ کنول پایا

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورت ساحل ہے یاں آغوش میں دریا
وہ حد کم ظرف ہیں جو ایک ساغر میں بہکتے ہیں
نہیں قطرہ بھی یاں ہنگام نوشانوش میں دریا
خموشی اور گویائی مری اِک اِک سے بہتر ہے
سکونت میں ہے یہ قطرہ ہے گہر تو جوش میں دریا
مہرک جاوے جو رودے چشم تر سے گوشہ دامن کا
نہ دیکھا ہو کسی نے ایسا اپنے ہوش میں دریا

دل چھٹ کے جاں سے گور کی منزل میں رہ گیا
ایسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
ناقص ہے دوستداری میں کامل نہیں ہے تو
دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا
سبقت جو زندگی میں سکندر سے کی تو کیا
اے خضر پیچھے موت کی منزل میں رہ گیا
آتش کو دست و تیغ سے ممکن ہوا نہ زخم
بے چارہ مر کے حسرتِ قاتل میں رہ گیا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا
طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
بے یار ساز وار نہ ہووے گا گوش کو
مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا
ترچھی نگہ سے طائر دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے تو اڑے گا نشانہ کیا
بولی مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

بیمارِ عشق رنج و محن سے نکل گیا — بے چارہ منہ چھپا کے کفن سے نکل گیا
مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دیے — صیّاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا
عالم جو تھا مطیع ہمارے کلام کا — کیا اسمِ اعظم اپنے دہن سے نکل گیا
زنجیر کا وہ غل نہیں زنداں میں اے جنوں — دیوانہ قید خانۂ تن سے نکل گیا

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا
جریدہ میں رہِ پُر خون عشق سے گزرا
جرس سے قافلے میں بحث نالہ کیا کرتا
نہ کرتی عقل اگر ہفت آسماں کی سیر
کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا
کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا
یہ دو ہفتہ بھی ہوتا تو لطف تھا آتش
اکیلا پی کے شراب دو سالہ کیا کرتا

تیر بارانِ بلا سے ہو گئی کشت اپنی سبز — رہ گیا دہقاں دعائے ابرِ رحمت مانگتا
یار کے دل میں کدورت آتی ہے رحمتی تو میں — دو گھڑی دل کھول کر رونے کی مہلت مانگتا
رہ گئی عزت خموشی کے سبب سے شکر ہے — زہر دیتا آسماں مجھ کو جو شربت مانگتا

بعد شاعر کے ہو مشہور کلامِ شاعر
شہرہ البتہ کہ ہو مردے کی گویائی کا
اے فلک کچھ تو اثر حسنِ عمل میں ہوتا
شیشہ اک رات تو قاضی کی بغل میں ہوتا

رات کو یس نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا
شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح
شادیِ دولتِ دیدار نے سونے نہ دیا
رات بھر کیں دلِ بیتاب نے باتیں مجھ سے
رنج و محنت کے گرفتار نے سونے نہ دیا
سچ ہے غم خواری بیمار عذابِ جاں ہے
تا دمِ مرگ دلِ زار نے سونے نہ دیا
تکیہ تک پہلو میں اس گل نے نہ رکھا آتش
غیر کو ساتھ کبھی یار نے سونے نہ دیا

کام کرتی رہی وہ چشم فسوں ساز اپنا
لب جاں بخش دکھایا کیے اعجاز اپنا
نہ سُنی یار نے اِک بات سخن سازوں کی
رہ گئے کھول کے مُنہ مفسدہ پرواز اپنا
پر کترنے سے تو صیّاد چھری ہی پھیرے
قصّہ کوتاہ کرے حسرت پرواز اپنا
روٹھ کر ملنے جو جاتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ
کل خفا تم تھے مزاج آج ہے ناساز اپنا

اُٹھ کے دیوار لحد سے مردے ٹکراتے ہیں سر
اک قیامت ہے صنم عالم تری رفتار کا
کچھ نظر آتا نہیں اس کے تصوّر کے سوا
حسرت دیدار نے آنکھوں کو اندھا کر دیا
آہ و نالے سے سوا چرچا خموشی کا ہُوا
پاس رسوائی نے ہم کو اور رسوا کر دیا
یار کا رخسارۂ رنگیں ہے آتش رشک باغ
جب نقاب اُلٹا در گلزار کو وا کر دیا

صلا

تصور ہر نفس ہے پیش چشم اس روئے روشن کا
نگہبان برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا
ڈراتا ہے کسے اے شیخ تو نارِ جہنم سے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

کس طرح تم سے نہ مانگیں تمہیں انصاف کرو — بوسہ لینے کا سزاوار دہن ہے کس کا
مفسدے دیکھے ہوں اس چشم سیہ سے کم ہیں — فتنہ پرداز جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا
خاک میں اس کو ملاؤ اسے برباد کرو — جان کس کی ہے مری جان یہ تن ہے کس کا
یار کو تم سے محبت نہیں تو اے آتش — خط میں القاب یہ پھر مشفق من ہے کس کا

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار
کب زمین و آسمان کا فاصلہ جاتا رہا
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان کو
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
جب اٹھایا پاؤں آتش مثل آوازِ جرس
کوسوں پیچھے چھوڑ کر میں قافلہ جاتا رہا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
رہا سالہا سال جنگل میں آتش — مرے سامنے بید مجنوں نہ نکلا

جو کہ لکھا خوب لکھا دست رس ہوتا اگر
چومتا میں ہاتھ اپنے کاتبِ تقدیر کا
کارواں تک روز واماندوں کو پہنچایا کیا
اے جرس شاہد ہوں تیرے نالے کی تاثیر کا
اس پری رو طفل کا دیوانہ ہوں آتش جسے
کھیل ہے اک توڑنا سودائی کی زنجیر کا

۱۵ نہ جانتا تھا غضب ہے نگہ کو تیرے دل

تجھی کو سامنے آفت رسیدہ ہونا تھا

ہر ایک گلبن ہے نخل ماتم ہر ایک بوٹے پر آب دیدہ

جو زخم گل میرے باغ کا ہے تو داغ پتا مرے چمن کا

نظر جو آجاتے بید مجنوں تو روؤں مجنوں کی یاد میں خوں

جو دیکھوں تیشہ تو سر کو پھوڑوں خیال بندھ جائے کوہکن کا

برہنہ آیا تھا وہ عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو

یہ لوٹے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھ کو لگا کفن کا

نگاہ اول میں چشم مے گوں یہ رنگ محفل کرے دگرگوں

وہ حال ہووے جو وقت آخر شراب خواروں کی انجمن کا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو

جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا

آتش نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا سینے میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا

۱۶ یہ دل لگانے میں میں نے مزا اٹھایا ہے

ملا نہ دوست تو دشمن سے اتحاد کیا

کہوں جو حالت دل یار سے تو کہتا ہے

جو کچھ کہ تو نے کہا میں نے اعتماد کیا

کروں میں شکر الٰہی کہاں تک آتش

درون صاف دیا پاک اعتقاد کیا

بنایا جادۂ رہ مجھ کو خاکساری نے پھرا جو مجھ سے زمانے میں وہ خراب ہوا

چھوڑ کر عشق صنم زاہد نہ ہو مفتونِ حور
کب یقین لاتا ہے دانا دُور کی افواہ کا

سنگِ گُل سے خول ہمارے آبلوں کا شوخ ہے
نقش پا سے پھولتا جاتا ہے گلشن زیرِ پا

شاخِ گُل کو بھی نہ آتش نے چھوا تھا اس پر
خول تری آنکھوں میں اے بلبل شیدا اُترا

آتشِ مست جو مل جائے تو پوچھوں اس سے
تو نے کیفیت اُٹھائی ہے خرابات میں کیا؟

دل شہیدِ رہ داماں نہ ہوا تھا سو ہوا   ٹکڑے ٹکڑے جو گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
برق بے نور ہے اس رُخ کی چمک کے آگے   عالمِ نور کا انساں نہ ہوا تھا سو ہوا
میں نے نرگس نہ کیا اس کا تڑپ کر دامن   سرِ جلاد پہ احسان نہ ہوا تھا سو ہوا
آتشِ عشق سے ہے داغ سراپا میرا   آدمی سرو چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا
گردِ رہ بن کے ہوا صندلِ پیشانی یا   ذرہ خورشید درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا
پہلے ہی مصرع سودا ہے رُلاتا آتش   تجھے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے

ارادہ کون سے در پر کروں میں دادخواہی کا
غنیمت جان اسے دل جنبشِ ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا
زیادہ زخم سے انسان کو احسان اُٹھانا ہے
نہ ہوتا خوب ہے ظلِ ہمائے بادشاہی کا
دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذر خواہی کا

جنونِ کامل اُٹھا صحرا کو چل زنداں سے دیوانے
نہیں کھُلتا ہے بے میداں کے جوہر سپاہی کا
مرکّب ہے یہ سرتاپا خطا سے اور نسیاں سے
خیالِ خام ہے انساں کو دعویٰ بے گناہی کا
اس نے دکھلائی مجھے صورتِ ابرِ رحمت
میں تو آتش ہوں غلام اپنی سیہ کاری کا
فرصت اک دم عہدِ طفلی میں نہ رونے سے ملی
پرورش پایا ہُوا ہوں دامنِ سیلاب کا
سیر کر لے دو گھڑی دل اس میں بہلا لیتے ہیں
دل ہمارا ہے مرقع صحبتِ احباب کا
مسندِ شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں
فرش ہے گھر میں ہمارے چادرِ مہتاب کا
ساحلِ مقصود دیکھا میں نے جاکر گور میں
ڈوبنا کشتیِ تن کو مژدہ تھا پایاب کا
بے تکلف آستانِ یار پر مارا قدم
دُور کوسوں رہ گیا ہم سے محلِ آداب کا
ایک جا مثلِ دُرِ غلطاں کہیں ٹھہرا نہ پاؤں
اخترِ اقبال ہوں میں گردشِ ایام کا
دل کو اُلجھایا گرہ پڑنے نے زلفِ یار میں
دانہ کیا دھوکا مجھے دیتا ہے عقدہ دام کا
ماتم دریا دلاں شادی تنک ظرفوں کی ہے
گریۂ مینا ہے باعث خندہ ہائے جام کا

چشمِ گریاں سے گناہِ عشق ثابت ہو گیا
واقعی کرتا ہے تر دامن چھلکنا جام کا
اے تپِ غم گور ہیں پیچل جوانی میں مجھے
دوپہرے موسمِ گرما ہیں وقت آرام کا!
خاتمِ دستِ سلیماں قدر کیا رکھتی زباں
لوحِ محفوظ اک نگینہ ہے ہمارے نام کا
زخمِ کاری کے جو کھانے کو میرا دل دوڑا   سر بکف میں طرف کوچۂ قاتل دوڑا
دوست و دشمن نے کیے قتل کے ساماں کیا کیا
جانِ مشتاق کے پیدا ہوئے خواہاں کیا کیا
آفتیں ڈھاتی ہے وہ نرگسِ فتاں کیا کیا
داغ دیتی ہے مجھے گردشِ دوراں کیا کیا
پھر سکی میرے گلے پر نہ چھری "ہے ظالم"
ورنہ گردوں سے ہوئے کارِ نمایاں کیا کیا
گردشِ چشم دکھاتا ہے کبھی گردشِ جام
میری تدبیر میں پڑتا ہے یہ دوراں کیا کیا
چشمِ بینا بھی عطا کی دلِ آگہ بھی دیا
میرے اللہ نے مجھ پر کیے احساں کیا کیا
ص ۲۳ بغل میں لے کے یوسف کو اکیلا واں سے گزرا میں
قدم رکھتے ہوئے جس راستے میں کارواں کھٹکا
محبت دل نے کی کس بے یقیں عیار سے آتش
جو کچھ نیکی کی بھی ہم نے کبھی وہ بدگماں کھٹکا

میرا جگر جلانے سے کیا ہاتھ آئے گا
اُس در کا پردہ اے نفسِ آتشیں جلا

خضر سے رہِ وطن کیا سمجھ کے پوچھوں میں
مجھے تو خود یہ غریب الوطن نظر آیا

کیا ہے عشق کو آساں سمجھ کے آتش نے
کمال ہم کو تو مشکل یہ فن نظر آیا

ص۲۶ نہ پوچھ حال میرا چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اثر کیا طپشِ دل نے آخر اُس کو بھی!
رقیب سے بھی میرا ذکر غائبانہ ہوا

خدا دراز کرے عمر چرخِ نیلی کو
یہ بیکسوں کے مزاروں کا شامیانہ ہوا

ص۲۶ پھٹے کپڑے گزی کے اس سے ہم بہتر سمجھتے ہیں
اگر اُترا ہوا ہو دے تنِ نواب کا جوڑا

ص۲۹ اس قدر اپنا ہمیں دی ہے بتوں کے عشق نے
حوصلہ جاتا رہا دل کو خدا کی یاد کا

ص۳۰ وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سینکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا

باغ سنسان نہ کر ان کو پکڑ کر صیاد
بعدِ مدت ہوئے ہیں مرغانِ خوش الحاں پیدا

بے حجابوں کا مگر شہر ہے اقلیمِ عدم

دیکھتا ہوں جسے ہوتا ہے وہ عریاں پیدا
موجد اس کی ہے سیہ روزی یاران تنگ
ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا

ص۱۲ نے کشش معشوق میں پاتا ہوں نے عاشق میں جذب
کیا بلا آئی محبت کا اثر جاتا رہا !
واہ رے اندھیر بہر روشنی شہر مصر
دیدۂ یعقوبؑ سے نور بصر جاتا رہا
تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا
کمال دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی ماریاسمن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہاں بگڑا
نہ چھوٹے گا یہ دھڑا اگر اس کو اے قاتل نہ بن لڑکا
وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبا ہے کیچڑ کا

ص۲۲ مسجد سے میکدے میں مجھے نشہ لے گیا
موج شراب جادہ تھی راہ صواب کا
مشق خرام میں عرق افشاں ہے بوئے یار
چھڑکاؤ ہو رہا ہے زمیں پر گلاب کا
جو چاہیں لکھ لیں کاتب اعمال چار دن
دیکھیں گے روز حشر میں کاغذ حساب کا

ص۲۵ رنج و راحت کا مرے واسطے ساماں ہوگا
مشعلِ راہِ عدم داغِ عزیزاں ہوگا
رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو
گل تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا
نالۂ بلبل شیدا میں اگر ہے تاثیر
دستِ صیاد میں گلچیں کے [illegible] ہوگا
بوئے مے کھینچتی ہے اس میکدے [illegible]
محتسب توڑ کے شیشے کو [illegible] ہوگا
تیری فریاد کا محتاج میں واماندہ نہیں
اے جرس میرے لیے قافلہ نالاں ہوگا
بعد میرے نہ گرفتار ملے گا مجھ سا
زلفِ خوباں کا بہت حال پریشاں ہوگا
ص۲۶ کون چھینے بت کو توڑے برہمن کے دل کو کون
اینٹ کی خاطر کوئی کا فر ہی مسجد ڈھائے گا
یہ صدا آتی ہے مجھ دیوانے کی زنجیر سے
امن چاہے تو دیارِ بے خودی میں پائے گا
آستانِ یار سے اٹھنے کا قصد آتش نہ کر
چھوڑ کر اس در کو سر دیوار سے ٹکرائے گا
دم میں جب تک دم رہا تیرے جلو میں اے جنوں
میں گریباں چاک بھی باندھے ہوئے دامن رہا
ص۲۷ ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

معتقد کو تری تصویر کا سودا مبارک ہو
مقام گیسوئے مشکیں و خال عنبریں آیا
کبھی قسمت کے لکھے سے زیادہ لکھ نہیں سکتا
وہ ناداں ہے جسے خوف کراماً کاتبیں آیا

حسن کس روز ہم سے صاف ہوا   گنہ عشق کب معاف ہوا
لے لیا شکر کرکے ساقی سے   درد اس میں ہوا کہ صاف ہوا
تیغ قاتل پر اپنا خوں جم کر   مخمل سرخ کا غلاف ہوا
زہر پرہیز ہو گیا مجھ کو   درد رمان سے المضاف ہوا
وعدہ جھوٹا نہ کر وہ مونہیں   قول سے فعل جب خلاف ہوا
رند مشرب ہوں مجھ کو کیا ہوئے   مذہبوں میں جو اختلاف ہوا

جامے سے جسم کے بھی میں دیوانہ تنگ ہوں
اب کی بہار میں اسے نذر جنوں کیا
آرائش اہل حسن کو جادو سے کم نہیں
بے تیغ تیرے دست نگاریں نے خوں کیا
آنکھوں سے جلتے اشک ٹپکنے لگا لہو
آتش جگر کو دل کی مصیبت نے خوں کیا

حال پیری کسے معلوم جوانی میں تھا
کیا سمجھتا تھا کہ دو دن میں بدل جاوں گا
وہی دیوانگی میری ہے بہار آنے دو
دیکھ کر لڑکوں کی صورت کو بہل جاوں گا

نہیں اسرار سے آتش یہ پتلا خاک کا خالی   یہی وہ گرد ہے جس سے سوا آخر عیاں ہوگا

خُدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں دے تو نظّارہ ہوا ایسے سنبلستاں کا

شب مہتاب میں مُنہ کھول کر وہ شوخ سوتا ہے
ستارا آج کل چمکا ہُوا ہے ماہِ تاباں کا

ساقیا تعریف تیرے میکدے کی کیا کروں
ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا

رُخ و زلف پر جان کھویا کیا | اندھیرے اجالے میں رویا کیا
ہمیشہ لکھے وصفِ دندانِ یار | قلم اپنا موتی پرویا کیا
کہوں کیا ہوئی عمر کیونکر بسر | میں جاگا کیا بخت سویا کیا
مزا غم کے کھانے کا جس کو پڑا | وہ آنکھوں سے آنسو بہایا کیا

ابدال سے ہوا نہ اوتاد سے ہُوا
اے جذب دل جو کچھ تری امداد سے ہُوا

مومن سے بہتر اس کو سمجھتے ہیں اہل دل
کافر جو پیرِ عشق کے ارشاد سے ہوا

چلنا پڑے گا ملک عدم کو پیادہ پا
اس راہ میں نہیں ہے گذارا سوار کا

زباں سے اپنی تعریف اپنی آنکھوں کی وہ کرتے ہیں
لب معجز بیاں سے سُنتے ہیں افسانہ افسوں کا

کہن سالی میں بھی اُلفت وہی ہے نوجوانوں کی
وہی عشق آج تک ہے مجھ کو حسن روز افزوں کا

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا | ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا

رُخ بے داغ دکھلایا تو ہوتا گُلِ لالہ کو شرمایا تو ہوتا
چلے گا کبک کیا رفتار تیری یہ اندازِ قدم پایا تو ہوتا
بجا لاتے اسے آنکھوں سے اے دوست کبھی کچھ ہم سے فرمایا تو ہوتا
اکڑنا بھول جاتے سروِ شمشاد یہ قد موٹا سا دکھلایا تو ہوتا
کہے جلتے وہ سنتے یا نہ سُنتے زباں تک حالِ دل آیا تو ہوتا
سمجھتا یا نہ اسے آتش سمجھنا دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

ہوائے فصلِ گل بھڑکا رہی ہے آتشِ گل کو
چمن میں کر رہا ہے کار روغن آبِ شبنم کا

حالہ سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

تری مستانہ آنکھوں کی نہ گردش کا اثر دیکھا
مے گلرنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا

نیا غم دہ کیا صیاد نے اپنے اسیروں سے
کیا آزاد اسے جس مرغ کو بے بال و پر دیکھا

تڑپتے دیکھ کر مجھ کو کہا ہنس کر یہ اس بت نے
"خدا کے دوست کو رنج و الم میں بیشتر دیکھا"

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا نماکہ خیال
فکرِ رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

باغِ عالم میں نہیں کون ثنا خواں تیرا
ذکر کرتا ہے ہر اک مرغ ثنا خواں تیرا

کوئی تجھ سا نہیں، لاثانی ہے تو، اے محبوب
حق تو یہ ہے کہ جو عاشق ہو، تو انساں تیرا

کون عالم میں ہے ایسا، جو نہیں سر بسجود
کس کی گردن کو جھکاتا نہیں احساں تیرا

بانٹ چاہے جسے دولت دو جہاں کی اے دوست
چاہتا تیرے سوا کچھ نہیں خواہاں تیرا

عشق نے آنکھوں کو دیدار دکھایا آخر
پردہ پوشی سے ہوا حسن نہ پنہاں تیرا

نیّتِ اہلِ توکل ہے کرم نے بھر دی
سیر نعمت سے دو عالم کی ہے، مہماں تیرا

کس پری رشک کا دیوانہ ہے تو اے آتش؟
پاک رہتا ہے مرے یار [illegible] تیرا

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود تک — [illegible] طرح سے خاک [illegible] گیا
گرم کی تھی موسمِ گل کی ہوا نشتر طلب — خون جتنا تھا بدن میں جوش کھا کر رہ گیا
شمع ساں اظہار کا یارا نہ آتش کو ہوا — سرگذشت اپنی زباں تک اپنی لا کر رہ گیا

ایک رات

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا — بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی — سحر تک مہ و مشتری کا قِراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی — زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل — وہ شب صبحِ جنت کا جس پر گماں تھا۔

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل — فرحناک تھی رُوح، دل شادماں تھا
مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں! — مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا
حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی — کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
گیا تھا اسے بوسہ بازی نے پیدا — کمر کی طرح سے جو غائب وہاں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی — نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

جب کہا مر جاؤں گا اپنے گلے کو کاٹ کر
ہنس کے فرمایا نہیں مختار انساں مرگ کا

دانت ہلتے ہیں ہوئے ہیں موئے سر سارے سفید
گو ہنستی ہے سمجھ کر مجھ کو شایاں مرگ کا
کیوں نہ اے آتش جوانوں کی طرح باندھوں کمر
پیر ہوں درپیش ہے کوتاہ میداں مرگ کا

روئے مژہ اُن آنکھوں نے دل کو دکھا دیا
صیاد نے شکار چھری سے لڑا دیا
کافر سے بھی نہ ہو جو کیا نازِ حسن نے
عاشق کے دل کو توڑ کے کعبے کو ڈھا دیا
احسان مانو حسنِ خداداد کا بتو!
پتھر تھے تم کو شیشے سے نازک بنا دیا
مغرور ہو نہ حسن جوانی پر آدمی
پیری نے آسماں کی کمر کو جھکا دیا

آئینہ لے کے صنعتِ اسکندری کو دیکھ
تصویر ہے کھینچی ہوئی تصویر کا جواب
خط دیکھے کیسو اب کی زبانی یہ نامہ بر
تحریر کا جواب نہ تقریر کا جواب

بہتر دکھائی دیں کہیں شمس و قمر سے آپ
دیکھیں جو آئینہ کو ہماری نظر سے آپ
تا صبح گفتگو تھی نگاہوں میں یار سے
آنکھوں میں "دشمنوں کی" کیا گھر تمام رات
ہمدلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست
بھولتا ہے کوئی بیتابی دل کا عالم
یاد آدیگی کل اے دردِ جگر آج کی رات
آئے بہار جائے خزاں ہو چمن درست
بیمار سال بھر کے نظر آئیں تندرست
کم شاعری بھی نسخۂ اکسیر سے نہیں
مستغنی ہو گیا جسے آیا یہ فن درست
کون پوجے بُت کو کس سے ہو سکے یاد خُدا
اپنے اپنے حال میں ہیں کافر و دیندار مست

آزارِ عشق سے یہ ہُوا ہوں مَیں ناتواں
پتھر کی چوٹ ہے مجھے گل برگ تر کی چوٹ

نکلا کرتے ہیں شب و روز اس سے متصل
سر ہے ہمارا اور تیرے سنگ در کی چوٹ
مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ
اے آسماں دکھائیں گے آیا جو بام پر
پیدا کیا ہے ہم نے بھی شمس و قمر کی چوٹ
بد بین کو اپنی بزم میں اے بُت جگہ نہ دے
پتھر کو کاٹتی ہے یہ کافر نظر کی چوٹ
ہوتا ہے آہ سرد سے یہ اپنے دل میں درد
پُروا ہوا میں دکھتی ہے جیسے بشر کی چوٹ
مفلس کا کام یاں نہیں دولت کا کھیل ہے
دُنیا قمار خانہ ہے چلتی ہے زر کی چوٹ
بدتر نہیں ہے غم غمِ فرزند سے کوئی
دل کو نصیب ہو نہ الٰہی جگر کی چوٹ
صدمہ فراق کا نہ ہو مشتاق وصل کو
اس کے عوض لگے اسے تیر و تبر کی چوٹ
سودائے عشق ہو نہ تمھارے دماغ میں
آتش بجھا ہی دیتی ہے انساں کو سر کی چوٹ
دل میں گھر کر کے منہ آنکھوں سے چھپاتے ہو عبث
ناز و انداز سے باہر ہوئے جاتے ہو عبث
چوٹی ایڑی سے مری جاں بڑھاتے ہو عبث
بوٹے سے قد کو یہ شاخ اور لگاتے ہو عبث

مرد بھی تلوار کے آگے سے کوئی ہٹتے ہیں
ہم کو ابرو کے اشارے سے ڈراتے ہو عبث

فصل گل ہے لوٹئے کیفیت میخانہ آج
دولت ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج

بادشاہ وقت ہے اپنا دل دیوانہ آج
داغ سودا ہم کو دیتا ہے جنوں نذرانہ آج

دولتِ دنیا سے مستغنی ہوں میں دیوانہ [illegible]
گنج گل دیتا ہے میرے [illegible] ویرانہ آج

امتیاز خوب و زشت اپنے زمانے میں نہیں
ایک ساں ہے آہوئے مست و سگ دیوانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرف شیشہ و پیمانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کے نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

عرش پر ہے ان دنوں میں اہل دنیا کا دماغ
کونسا گھر ہے نہیں ہے جس میں بالاخانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمت مردانہ آج

غرق ہونا پار اتر جانا ہے بحر عشق سے
لے چلے کشتی کو اپنی جانب گرداب موج

اپنا مہمان طفیلی جانتے ہیں ہم اسے
آنے گی گھر میں ہمارے ہمرہِ سیلاب موج

دم فنا ہووے تو ممکن ہے سخن گوئی کا ترک
آب دریا خشک ہو جائے تو ہو نایاب موج

کیا سمجھ کر بحرِ ہستی میں کروں راحت طلب
دیکھتا ہوں روز و شب دریا میں ہے بیخواب موج

گنج بادآورد بہا لادے جو خسرو ہو کوئی
اب بجھ آتش بیانِ عالم اسباب موج

آتش خدا سخن بہ دست ہتو کرنے ہیں آج کل
ہندوستاں سے جانب بیت الحرام کوچ

آتش اک رات جو تنہا وہ دل آرام ہے
سجدۂ شکر کروں پڑھ کے میں دو رکعت صبح

ے نے کیے عذار بت شوخ و شنگ سرخ
کندن کا اور آگ میں ہوتا ہے رنگ سرخ

گو صید ناتواں ہو پر اتنا ہو گرم خون
ہو جائے چھلے پڑ کے زبانِ خدنگ سرخ

کیفیتِ شراب ہے جوہر شجاع کا!
ہوتا ہے چہرہ غازیوں کا وقتِ جنگ سرخ

اس طفل نے بڑھا کے شفق سے ملا دیا
جس دن قریب شام اُڑا! پتنگ سرخ

پھوٹا لحد میں دل کا پھپھولا تو دیکھنا
ہو جائے گا مزار کا آتش سے رنگ سرخ

کوچۂ یار میں ہو روشنی اپنے دم کی
کعبہ و دیر کریں گبر و مسلمان آباد

ساری رونق ہے یہ دیوانوں کے دم سے آتش
طوق و زنجیر سے ہوتا نہیں زنداں آباد

قطرۂ اشک میں سرخی کا کہیں نام نہیں
لہو تیرا بھی ہوا اے دلِ ناکام سفید

قبر پہ یار نے قرآن پڑھا میرے بعد
شرطِ الفت کی ملی مجھ کو جزا میرے بعد

ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم!
نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

زندگی تنگ ہیں قیامت کے یہ ملنے عمر کے
مجھ کو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

خونِ ناحق کا مرے کھینچے گا خمیازہ
ہاتھ ملیے گا بہت کل کے حنا میرے بعد

قبر پر فاتحہ کو آئے وہ شوخ اے آتش
نیک توفیق دے اس بت کو خدا میرے بعد

تا چند کروں سینے میں، میں آہ و فغاں بند
کب تک رہے اس گھر میں الٰہی یہ دھواں بند

دل میں آتا ہے کہ اک دن رو کے دھو ڈالوں انہیں
روز لکھتے ہیں کراماً کاتبیں دو چار بند

پھوڑتا تیشے سے اپنا سر نہ تھا اے کوہ کن
چھیننا شیریں کو تھا پرویز کا سر توڑ کر

کار مردانہ کیا چاہے تو اے دست جنوں
کھینچ دامانِ پری میرا گریباں چھوڑ کر

اس زمانے میں سپاہی نہیں بیکاری میں
نہ تو تلوار ہی ہے نہ کٹاری تیار

ہم سے خلاف ناحق صیاد و باغباں ہے
نالوں سے اپنے کس دن بجلی گری چمن پر

ملتا ہے کیا جو آتش مرتے ہیں اہل دنیا
اک دو وجب زمیں پر اس یک دو گز کفن پر

عروجِ حسنِ بازاری پسندِ دل نہیں ہوتا
مجرد ہوں مگر رغبت نہیں قحبہ کے جوبن پر

رنگ میرا اور تیرا دیکھ کر حیراں ہوئے
نقش بندانِ خزاں و نقشبندانِ بہار

کیا سمجھ کر یار کو میں غنچے سے تشبیہ دوں
یاں دہن میں ہے زباں واں ہے زباں بالائے سر

حسرتِ شاہی ترے در کے فقیروں کو نہیں
تخت ہے ہم کو زمیں چترِ آسماں بالائے سر

خود چلوں گا یار سے لینے جوابِ خطِ شوق
اور میں مرتا ہوں دو دن نامہ بر کا انتظار

دیوانے آج کل کے کچھ آتش نہیں ہیں ہم
مدت ہوئی کرے سر و دست نہ سے بگاڑ

ساتھ ہے بعد فنا حسرت فتراک ہنوز
دامن زین سے لپٹی ہے مری خاک ہنوز
کپڑے پھٹتے ہیں مرے خانۂ زنجیر میں بھی
پاؤں تو سست ہوئے ہاتھ ہیں چالاک ہنوز
کون کتنا ہے بسر ہو گئے ایام جنوں
اک گریبان نظر آتا نہیں بے چاک ہنوز
آنکھ بھر کر نہ کبھی چاند سی صورت دیکھی
نہیں آلودہ ہماری نگہ پاک ہنوز
باغباں کیسی بہار آئی ہے کیا عالم ہے
نظر آتے ہیں چمن میں خس و خاشاک ہنوز
کیا کروں اس کو نہ نکلے جو بخار اک دل کا
دو سمندر ہیں مرے دیدۂ نمناک ہنوز
اس قدر قحط ہے کس واسطے مے کا ساقی
زیر دیوار چمن ڈھونڈتے ہیں تاک ہنوز
استخواں خاک ہوئے خاک بھی برباد ہوئی
صاف ہوتا نہیں اس پر بھی وہ سفاک ہنوز
وہی پستی و بلندی ہے زمیں کی آتش
وہی گردش میں شب و روز ہیں افلاک ہنوز
برسوں سے رو رہا ہوں شب و روز متصل
ہنستے ہیں مدتوں سے مرے زخم تن ہنوز
عالم ان ابروؤں کی کجی کا جو ہے سو ہے
بل کھا رہی ہے زلف شکن در شکن ہنوز

جنوں میں بھی ہوئی زائل نہ مجھ سے دانائی
رہا میں عالمِ دہشت میں بیشتر خاموش

آفتِ جاں ہے ترا اے سروِ گل اندام رقص
ساتھ ہر ٹھوکر کے کرتا ہے ہمارا کام رقص

طبعِ عالی باز رکھتا ہے تماشے سے مجھے
بام پر گویا کہ میں ہوں اور زیرِ بام رقص

کس طرح کرتا ہے وہ ذلت گوارا آدمی
فی الحقیقت یہ نہیں غیر از خیالِ خام رقص

دم فنا ہوتا ہے دامن کی ہر اک ٹھوکر کے ساتھ
خرمنِ امید کو ہے برق کہ پیغام رقص

حرصِ دنیا حسنِ غارتگر کو رکھتی ہے خراب
بہرِ زر کرتے ہیں محبوبانِ سیم اندام رقص

سینہ کوبی کی صدا ہے یہ کہ گھنگرو کی صدا؟
بیقراری ہے تری؟ یا اے دلِ ناکام رقص

چشمِ راحت کار ذلت میں خیالِ خام ہے
عمر بھر رقاص کو رکھتا ہے بے آرام رقص

اپنے فعلوں سے تعجب ہے نہ ہووے جو فساد
زن سے مطلب ہے زمیں سے مدعا زر سے غرض

فرشِ قالیں و نمد کا آشنا ہوتا نہیں
آتشِ درویش کو ہے اپنے بستر سے غرض

نشۂ عشق کا اثر ہے شرط لب خشک، اور چشم تر ہے شرط
یہ تمنا ہے بندگی تیری اس قدر ہو کہ جس قدر ہے شرط
گلشن عیش کے نظارے کو مثل غنچہ گرہ میں زر ہے شرط
چاند سے مکھڑے کو دیکھا آنکھیں روشن ہو گئیں
پرتو مہتاب سے بن جاتے ہیں روزن چراغ
یاد رکھنے کی جگہ ہے یہ طلسم حیرت
صبح کو دیکھتے ہی بھول گئے شام کو ہم
کوچۂ یار میں اپنا جو گزر ہوتا ہے
نگراں رہتے ہیں حسرت سے در و بام کو ہم

تم!

غیرت مہر رشک ماہ ہو تم خوب صورت، ہو بادشاہ ہو تم
کیونکر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ کیسے خوش چشم خوش نگاہ ہو تم
کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے ہم گنہ گار بے گناہ ہو تم
ساقی ہے یار ماہ لقا ہے شراب ہے
اب بادشاہِ وقت ہیں اپنے مکاں میں ہم
کیا حال ہے کسی نے نہ پوچھا ہزار حیف
نالاں رہے جرس کی طرح کارواں میں ہم
چمن میں رہنے دے کون آشیاں نہیں معلوم
نہال کس کو کرے باغباں نہیں معلوم

کیا ہے کس نے طریقِ سلوک سے آگاہ
مرید کس کا ہے پیرِ مغاں نہیں معلوم
سپرد کس کے مرے بعد ہو امانتِ عشق
اُٹھائے کون یہ بارِ گراں نہیں معلوم
ملا تھا خضر کو کس طرح چشمۂ حیواں
ہمیں تو یار کا اپنے دہاں نہیں معلوم

عشق کے صدمے اُٹھانے کو بھی جی چاہیے
خوں ہُوا میری طرح آتش کسی کا دل کہاں

آباد میرا خانۂ ویراں ہے ان دنوں
سیلاب مجھ غریب کا مہماں ہے ان دنوں

برق کو اس پر عبث گرنے کی ہیں تیاریاں
برگِ گل ہی آشیاں کو اپنے ہیں چنگاریاں
خندۂ گل سے صدائے نالہ آتی ہے مجھے
خونِ بلبل سے مگر سینچی گئی ہیں کیاریاں
خوفِ خالق ہے وگرنہ محتسب کیا مال ہے
خانۂ قاضی میں [illegible] میخواریاں

عزمِ طوافِ کعبہ ہے اب کچھ غرض نہیں
آتش بتانِ ہند پری ہوں کہ حور ہوں

دو قدم غربت سے گر سوئے وطن جاتا ہوں میں
پاؤں شل ہو جاتے ہیں دیوار بن جاتا ہوں میں
حسرتِ سودا ہے مرا اپنا گریباں چھوڑ کر
پھاڑنے اس گلبدن کا پیرہن جاتا ہوں میں

پسے دل اس کی چتون پر ہزاروں موئے بے ساختہ پن پر ہزاروں
مری ضد سے ہُوا ہے مہرباں دوست مرے احساں ہیں دشمن پر ہزاروں
نہ اٹھکیلی سے چل! ہوتے ہیں صدمے دل شیخ و برہمن پر ہزاروں
ہُوا سرخم نہ زیر تیغ جلّاد رہے بوجھ اپنی گردن پر ہزاروں
ترے کشتہ ہیں ہم آنکھیں ہیں گے ہمارے سنگ مدفن پر ہزاروں
عجب کیا ہے اگر پروانے بے شمع جلیں آتش کے مدفن پر ہزاروں

کبھی کچھ کام بھی تو آئے تیری ہمتِ عالی
مگر چہرہ ہی لکھوایا ہے لے آتش سواروں میں
ہُوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ اور تجلّی کا
وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کوہساروں میں
ہراساں ہوتے ہیں کب مردِ یکہ تاز کثرت سے
کوئی دو چار ہی جانباز ہوتے ہیں ہزاروں میں

رفیق حال مُرے وقت میں نہیں کوئی
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں
بُتوں کے قہرِ غضب کا کسے ہے اندیشہ
خدا نہیں یہ پیمبر نہیں امام نہیں

تم تو غریب خانے میں آئے نہ ایک روز
فرمائیے تو شب کو کسی وقت آؤں میں
آتش غلامِ ساقی کوثر ہوں چاہیے
فردوس کا کھلا ہُوا دروازہ پاؤں میں

دیوانگی نے کیا کیا عالم دکھا دیے ہیں
پریوں نے کھڑکیوں کے پردے اُٹھا دیے ہیں

سوزِ دل و جگر کی شدّت پھر آج کل ہے
پھر پہلوؤں کے تکیے مشعل بنا دیے ہیں

مانگوں؟

خارِ مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں
شمع گل ہووے جو صبحِ شبِ ہجراں مانگوں
اوس پڑنی بھی ہو موقوف جو باراں مانگوں
خاک میں بھی جو ملوں میں تو کسی صحرا میں
تم سے مٹی بھی نہ اے گبرِ مسلماں مانگوں
پادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں
دیدیا کیجیے سودائی تمھارا ہوں میاں
سونگھنے کو جو کبھی زلفِ پریشاں مانگوں

کھینچ اے ہوائے صحرا ورنہ اُٹھا چکے ہیں
لڑکوں کے سنگریزے دیوار تا بگردن
شمشیر کھینچنی اے مانی تجھے پڑے گی
تصویر کر نہ میری تیار تا بگردن

اس کی رسوائی بھلا مدّ نظر کیونکر کریں
میرے ماتم میں عزیزاں چشم تر کیونکر کریں
اپنے خوں کی بو نہیں آتی ہے یاں کی خاک سے
زندگی میں کوئے قاتل سے سفر کیونکر کریں

آج تک اپنی جگہ دل میں نہیں اپنے ہوئی
یار کے دل میں بھلا پوچھو تو گھر کیونکر کریں

دردِ سر کے واسطے صندل نہ رگڑا جائے گا
ہو سکے آتش نہ جو وہ دردِ سر کیونکر کریں

بلا اپنے لیے دانستہ نادان مول لیتے ہیں
عبث جی بیچ کر الفت کو انساں مول لیتے ہیں

میں اس گلشن کا بلبل ہوں بہار آنے نہیں پاتی
کہ صیاد آن کر میرا گلستاں مول لیتے ہیں

کیا گو نقشِ پائے مور ہم کو خاکساری نے
جو اب بھی چاہیں تو تختِ سلیماں مول لیتے ہیں

یہ آتش نالۂ عشاق معشوقوں کو بھایا ہے
کہ صیادوں سے مرغانِ خوش الحاں مول لیتے ہیں

چاہتا ہوں جو وہ خاصیتِ دلبر میں نہیں
ہے وہ مطلب مجھے جو کہ مقدر میں نہیں

روئے گل کو دیکھ کر شبنم کو کہتا ہے وہ گل
کیا ہی پھبتی ہے یہ کیڑا لگ گیا بانات میں

مرے دل کو شوقِ فغاں نہیں مرے لب تک آتی دعا نہیں
وہ دہن ہوں جس میں زباں نہیں وہ جرس ہوں جس میں صدا نہیں

نہ تجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تابِ جمال ہے
انھیں کس طرح سے دکھاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ خدا نہیں

عجب اس کا کیا نہ سماؤں میں جو خیالِ دشمن و دوست ہے
وہ مقام ہوں کہ گزر نہیں وہ مکاں ہوں کہ پتا نہیں

یہ خلاف ہوگیا آسماں یہ ہوا زمانہ کی پھر گئی
کہیں گل کھلے بھی تو بو نہ دے کہیں حسن ہے تو وفا نہیں
مرضِ جُدائی یار نے یہ بگاڑ دی ہے ہماری خو
کہ موافق اپنے مزاج کے نظر آتی کوئی دوا نہیں
چلیں گو کہ سینکڑوں آندھیاں چلیں گرچہ لاکھ گھرائے فلک
بھڑک اُٹھے آتشِ طور بھی کوئی اس مرح کی دوا نہیں
تصوّر سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی رو بہ رو برسوں
برابر جان کے رکھا ہے اس کو مرتے مرتے تک
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں
کیا کہوں یار سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے
حضرت دل جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں
اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پرشکن میں
اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں
حاصل کیا ہے تونے صدقے سے اس قدر زر
سونے کے بت بندھے ہیں بازوئے برہمن میں
اک تختہ ہفت کشور، دہلی کا ہے ہمارے
نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

آتش صنم بھی کرنے لگے بے نیازیاں
ہیں ناخدا تو شکر خدا کی جناب میں

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

عجب کیا ہے جو بوسے لوں میں پیشانی مجنوں کے
توجہ کس قدر شاگرد پر استاد کرتے ہیں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں
ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں

صدمے پہنچے ہیں ہمارے بازوؤں پر سینکڑوں
گم ہوئے ہیں اپنے یوسف سے برابر سینکڑوں

دل دیا چاہے تو آتش دلربا موجود ہیں
خوبتر سے خوبتر بہتر سے بہتر سینکڑوں

محتسب عقل جو رکھتا ہے تو ٹکرانے نہ جا
شیشہ و جام مئے ہوش ربا رکھتے ہیں

دہن یار کو ہم تو نہ کہیں جوہر فرد
منطقی اس میں بہ حجت کریں جا رکھتے ہیں

جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے
اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں

اپنے ہر شعر میں ہیں معنیٔ تہ دار آتش
وہ سمجھتے جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

~~~~~~~~
~~~~~~~~

عالم کو لوٹ کھایا ہے اِک پیٹ کے لیے
اس غار میں گئی ہیں ہزاروں ہی غارتیں
آتش یہ شش جہت ہے مگر کوچہ یار کا
چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پر اشارتیں
ڈرا تا ہے بہت رندوں کو ذکر نار دوزخ سے
تماشا ہو جلے واعظ لگ اُٹھے آگ منبر میں
سالک راہ محبت کو پس و پیش نہیں
مصلحت بیں نہیں بیں عاقبت اندیش نہیں
حیا و شرم آنکھیں سامنے کرنے نہیں دیتیں
لڑکپن ہے ابھی وہ صورت عاشق سے ڈرتے ہیں
دوست ہی جب دشمن جاں ہو تو کیا معلوم ہو
آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو
آنکھ پاتے ہی خیال یار نے کی دل میں راہ
مل ہی رہتا ہے مکاں جس کا پتہ معلوم ہو
بید مجنوں دور سے خم ہو گیا تسلیم کو
ہر بگولا سرو قد اُٹھا مری تعظیم کو
ہمت مردانہ نے آتش کیا ہے بے نیاز
جانتا ہوں میں گدا سلطان ہفت اقلیم کو
کمال شہرۂ حسن حبیب سنتا ہوں ڈھلا ہوا کوئی مضمون آبدار نہ ہو
حشر نے روز میں اتنا تو کہوں گا آتش
ان پری رویوں نے دیوانہ بنایا مجھ کو

اے بتو دل میں تمھارے جو اثر ہو تو نہ ہو
زلزلے آئے ہیں ان نالوں سے کہساروں کو
جا کے اس باغ سے کیا یاد کریں گے آتش
چشمِ تر ہم کو ملی خشک زباں خاروں کو
برہمن آنکھوں کو ملتا ہے جو پائے بُت پر
رشک آتا ہے مجھے سنگ در یار نہ ہو
نام سُنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جُدائی کی شب تار نہ ہو
ترکِ الفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار
دل سے بیزار تو ہے جاں سے بیزار نہ ہو
خوں ہُوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کیونکر خُشک ہو
جو روئے حال پر اپنے، کیا کسی کو ہنسے
وہ دل دکھائے کسی کا جو دردمند نہ ہو
برابر اُس کے کھڑا ہو کے سرو اکڑتا ہے
الٰہی قد بھی کسی کا بہت بلند نہ ہو
دیکھ لوں پھاڑ کے آئینہ میں لے دستِ جنوں
رہنے دو زیب جو دے چاکِ گریباں مجھ کو
کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تیری محفل کو
شادی نہیں قبول مجھے غم قبول ہے
میری خوشی سے تنگ مرا پیرہن نہ ہو

رو اس قدر کہ آبروے ابر تر رہے
اتنا نہ ہنس کہ برق کبھی خندہ زن نہ ہو
پیچھے رکھنا میرے داغوں پر اسے اے دوستو
آگ پر رکھ دیکھو پہلے مرہم زنگار کو!

ص۱۴۳ جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو
عصا پیچھے دیا پہلے جلایا دست موسےٰ کو
وہ منصف ہوں اگر میں نے کیا ختم کلام اللہ
ثواب سورۂ یوسف دیا روح زلیخا کو

ص۱۴۴ بے قراری میں مری یارب یہ اثر پیدا ہو
سر کو دیوار سے ٹکراؤں تو در پیدا ہو
خوش جمالوں سے زمانہ نہیں رہتا خالی
مہر پنہاں ہو نظر سے تو قمر پیدا ہو
شعر گوئی میں مری طبع کو دقت ہے پسند
خشک دو لب ہوں تو اک مصرع تر پیدا ہو
عہد پیری میں طبیعت کو جواں ہم بھی کریں
خوبصورت جو وفادار بشر پیدا ہو
محبت کی نگہ سے لطف ہر اک رنگ میں پایا
تماشا تھا جو دیکھا چشم بلبل سے گلستاں کو
بس ہو تو ابھی چیر کے پہلو کو نکل جائے
رکھتا ہے بہت تنگ یہ کونا مرے دل کو

صـ ۱۳۸ نکلتی کس طرح ہے جان مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کیا دیکھتے جاؤ
نسیم نو بہاری کی طرح آتے ہو گلشن میں
تماشائے گل و سرو صنوبر دیکھتے جاؤ
قدم انداز سے باہر ہوئے جلتے ہیں صاحب کے
ستم رفتار میں کرتی ہے ٹھوکر دیکھتے جاؤ
ملیں وہ راہ میں اکی تو کہتا ہوں جو ہو سو ہو
دکھا دو گھر مجھے اپنا مرا گھر دیکھتے جاؤ
روش مستانہ چلتے ہو قدم مستانہ پڑتے ہیں
خدا کے واسطے پھر ہمیں پھر دیکھتے جاؤ
کوئی اُن سے کہے مُنہ پھیر کر جو قتل کرتے ہو
تڑپتا ہے تمہارا کشتہ کیونکر دیکھتے جاؤ
نہ پھیرو اس سے مُنہ آتش جو کچھ درپیش آجاوے
دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدر دیکھتے جاؤ
صحرا کو چلو چاک گریباں کرو آتش
لنگر میں نہیں پاؤں نہ ٹھہرے گا نہ ہاتھ
پاؤں کو ان کے چھوا میں نے تو ہنس کر بولے
بھٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ
کہتا ہے وہ شوخ آئینہ میں عکس سے آتش
تم ہم سے زیادہ ہو تو ہم تم سے زیادہ
سبزہ خط لوں گا کر تو نے مارا ہے جنہیں حشر ان لوگوں کا ہوگا خضر سبزہ کے ساتھ

خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے

گیسوئے مشکیں رُخِ محبوب تک آنے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے

دور کروایا پسینے نے نقابِ گلِ عذار
قطرۂ شبنم بھی دیوارِ چمن ڈھانے لگے

آتش ان سے نہیں نظارہ کا لپکا چھٹتا
میری آنکھوں کو ہے شاید کہ مرلول بھاری

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کی بو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گلبدن معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصہ میں آئی بو تیری

کوچۂ دلبر میں میں، بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے

دورِ گردوں ہے خداوندا کہ یہ دورِ شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

گردشِ چشمِ غزالاں گردشِ ساغر ہے یاں
خوش رہیں اہلِ وطن دیوانہ بن میں مست ہے

ص ۱۴۵ سودائے راہِ یار کا اللہ رے اثر
جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی

ص ۱۴۹ تو نکلتا نہیں شمشیر بکف اے قاتل
موت میرے لیے تلوار لیے پھرتی ہے

حالِ غش سب مجھے سمجھا ہے جنوں نے شاید
وحشتِ دل سرِ بازار لیے پھرتی ہے

ص ۱۵۰ کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

ص ۱۵۱ غیرتِ نالہ و فریاد نہ کھوائے آتش
آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

ص ۱۵۲ ہمیشہ ہم اڑاتے ہیں گردِ پیرہن عاقل
نہیں سمجھتے کہ ہے زیرِ پیرہن مٹی

کوئی زمانے سے جاتا ہے کوئی آتا ہے
کسی کو کچھ کسی کا مقام ہوتا ہے

ص ۱۵۳ چھوٹ کر قفس کے پھندے سے ہوں تنگ اے آتش
مجھ کو آزادی سے بہتر وہ گرفتاری تھی

ص ۱۵۴ ذاتِ باری کو کیا ظالم بتاں نے ثابت
عدل کرتے یہ اگر ان کی خدائی ہوتی

حسن وہ شے کہ پتھر میں اثر کرتا ہے
چشم عاشق کی طرح آئینے حیران ہو گئے
جو چلن چاہیں چلیں آتش بتانِ بے وفا
حسن جب پیدا ہوا سب عیب پنہاں ہو گئے

گور میں بھاگ اہلِ دُنیا سے — خلوت اس انجمن سے بہتر ہے
ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر — ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
مانگیے کیا خدا سے چشمۂ خضر — کیا صنم کے دہن سے بہتر ہے

کنج تنہائی میں بھی چلّا کے رو سکتے نہیں
لوگ کہتے ہیں در و دیوار کے بھی گوش ہے
گل ہر اک ساغر بکف بلبل ہر اک نغمہ طراز
سیرِ باغ آتش مجھے ایامِ ناؤ نوش ہے

چلی ہے ایسی زمانے میں کچھ ہوا اُلٹی
کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا اُلٹی
نگاہ یار کی پھرتے ہی ہم سے اے آتش
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی

سر شمع ساں کٹائیے پہ دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

غیر رسوائی کبھی ان سے نہ کچھ حاصل ہوا
عشق سے نفرت ہے مجھ کو حسن سے پرہیز ہے
بلبل بستاں کے نالے سے یہ آتی ہے صدا
گوش گل نا آشنائے حرف شوق آمیز ہے

اشک کے ساتھ شامل ہے خونابِ دل پر داغ بھی
الحذر اے آستیں یہ آبِ آتش بیز ہے
تختہ پارہ کی طرح ہے حال دل آتش تباہ
بے قراری لجّہ دریائے طوفاں خیز ہے
جان کھوتا ہے عبث عشقِ بتاں میں آتش
سر کو نادان کوئی کہسار سے ٹکراتا ہے
آرزو رہ گئی اس کوچے میں پامالی کی
دھوم ہی دھوم فقط چرخِ جفاکار کی تھی
ہر دم تلف دروں سے ہم آفت طلب ہے
سب دشمنِ حیات جگر میں جو تب رہے
کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں ہے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے
اشتیاقِ وصل میں جان لب تک آئی ہے
عشق نے ستایا ہے حسن کی دہائی ہے
عرش سے بھی عالی ہے بامِ یار کا پایہ
آہ کی کمندوں کو عذرِ نارسائی ہے
مر بھی دیکھیے شاید گور پہ وہ شوخ آئے
یہ بھی آخری اپنی قسمت آزمائی ہے
عشق ہے مرے دل کو حسن کے نقشے کا
آنکھ کے پیالے سے حسرت گدائی ہے
پھر رہا ہے آنکھوں میں حسن پردہ سوزاں کا
بے نقاب یوسف سے ہم سے آشنائی ہے

جس قدر بڑھیں ان کو چند روز بڑھنے دو
دیکھیے تو زلفوں کو کس قدر رسائی ہے
رو سیاہ زاہد ہے سجدۂ ریائی سے
اس کے ماتھے کا گھٹّا داغِ پارسائی ہے
بھاگتے ہیں وہ ہم سے ان سے ہم لپٹتے ہیں آتش
واں وہی کدورت ہے یاں وہی صفائی ہے

ظاہر میں گرچہ کاہ ہوں باطن میں کوہ ہوں
اپنی طرف نہ کھینچ سکے کہربا مجھے
کب سے ہوں اشتیاق میں قاتل کی جان کے
یادش بخیر بھول گئی ہے قضا مجھے
پیتا ہوں میں ہنوز چھپا کر شراب کو
تا حال رند جانتے ہیں پارسا مجھے
ناز و نیاز کی ہے ترقی وہی ہنوز
صد آفریں ہے یار تجھے مرحبا مجھے
صورت حزیں نصیب گلوئے بریدہ ہے
آتش حلال کرتی ہے بانگ درا مجھے

گوش گل کو نالۂ مرغ خوش الحان چاہیے
ناقۂ لیلیٰ کو مجنوں ساحدی خواں چاہیے
رُوح کو تن میں خیال باغ رضواں چاہیے
تا قفس میں بند ہے شوقِ گلستاں چاہیے

اب تو آزردہ ہے تو لیکن ملے گا ہاتھ پھر
جس گھڑی آتش نکل جاوے گا پیارے شہر سے
دامن مرے قاتل کا نہ رنگیں ہو لہو سے
ہر چند کہ نزدیک ہو رگ کھلنے گلو سے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا!
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں آرزو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے
نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے
اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں کرتے

بے وفائی کا اگر عیب نہ ہوتا تم میں
اے بتو سجدہ خدا کو نہ مسلماں کرتے
اخوان کی عداوت سے نہ شہرۂ یوسف
کچھ پیش نہیں جاتی قسمت کے دھنی سے
افسانہ سے بدتر ہے جو ہو راز ہویدا
اظہار فقیری نہیں بہتر کفنی سے
افسوس کہ فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھا
سر پھوڑ کر مر جائیے اس تیشہ زنی سے
سینہ پر سنگ ملامت جو گراں جاں روکے
گرز رستم کو یقیں ہے کہ وہ انساں روکے
برق رفتار ہوں منزل ہے مرے زیر قدم
ابر گھیرے مجھے ہر چند کہ باراں روکے
کوچۂ تنگ میں ملتا ہے تو کہتا ہے وہ شوخ
مرد ہے وہ کہ جو ہم کو سر میداں روکے
دوڑ دانا ہل بلو میں انھیں میں دیوانہ
زعم میں اپنے مجھے لشکر طفلاں روکے
شوق صحرا سے نہیں پاؤں زمیں پر پڑتے
کس کو ٹھہرائے الجھ کر کسے داماں روکے

ماضی و حال

نہی چتون کی خونخواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
تیری آنکھوں کی بیماری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی نشوونما سرسبز ہے گورِ غریباں پر
ہوائے چرخ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

تعلق ہے وہی تا حال ان زلفوں کے سودے سے
سلاسل کی گرفتاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سر کا ٹپکنا ہے وہی رونا ہے دن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

رواج عشق کی وہی ہیں کشورِ دل میں
رسمِ وفا جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی جی کا ملانا ہے پکانا لے وہی دل کا
وہ اُس کی گرم بازاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

نیاز خادمانہ ہے وہی فضلِ الٰہی سے
بُتوں کی ناز برداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

فراقِ یار میں جس طرح سے مرتا تھا مرتا ہوں
وہ رُوح و تن کی بیزاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سودائے کاکل کا ہے عالم جو کہ سابق تھا
یہ شب بیمار پر بھاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جنوں کی گرم جوشی ہے وہی دیوانوں سے اپنی
وہی داغوں کی گلکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی بازار گرمی ہے محبت کی ہنوز آتش
وہ یوسف کی خریداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ہوتا ہے گل کے سونگھنے سے دونا گرفتہ دل
مجھ سا بھی بد دماغ، کم اس بوستاں میں ہے

دکھلا رہی ہے دل کی ضیا دو جہاں کی سیر
کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

اُس دلربا کے کوچہ میں آ کے ہوا سے جائے
اتنی تو جان اب بھی تنِ ناتواں میں ہے

ایسا بھی کوئی دور ہو گردش سے فلک کی
وہ لوگ زیادہ ہوں جو جھک جاتے ہیں کم سے

ساغر نعماؔن مئے حبِ علیؑ سے سرشار ہے
مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

سرو اولیٰ ہے مری آنکھوں میں گل انسب ہے
جو کہ ہے خوب ہے اللہ کا عالم سب ہے

کنجِ تنہائی میں آ کے خفقاں ہوتا تھا
اپنی پرچھائیں کی صورت سے بھی نفرت اب ہے

اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغِ بے آب ہے نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے کچھ موت نے فرصت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے مصیبت دی ہے

سر کاٹ کے کر دیجیے قاتل کے حوالے
ہمت مری کتنی ہے کہ احسان بلا لے
ہر قطرۂ خوں سوز دروں سے ہے اک اخگر
جلاد کی تلوار میں پڑ جائیں گے چھالے

ص ۱۴۹
یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا
نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں !
ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستاں ہے
نہ کہہ رندوں کو حرف سخت واعظ
درشت اہل جہنم کی زباں ہے
قد محبوب کو شاکر کہیں سرو
قیامت کا یہ اے آتش نشاں ہے

شہرۂ آفاق مجھ سا کون سا دیوانہ ہے
ہند میں ہوں پرستاں میں مرا افسانہ ہے
خار خارِ دل غنیمت جانتا ہوں عشق میں
زلف، دودِ آہ کی آراستی کا شانہ ہے
واسطے ہر شے کے دنیا میں مقرر ہے محل
شہر میں جب تک ہے مجنوں گنج بے ویرانہ ہے

یار کھینچے تیغ تیرے قتل کرنے کے لیے
سر جھکا آتش یہ جائے سجدۂ شکرانہ ہے
ستارہ آج کل چمکا ہوا ہے اپنا اے آتش
موافق ہے فلک اس ماہ رو کی مہربانی ہے
نصیحت کرتے کرتے اس نے دیوانہ کیا مجھ کو
الٰہی پند ناصح ہے کہ پریوں کی کہانی ہے
قیس و فرہاد سے دلدادہ ہزاروں آتش
تیشہ بیکار رہے گا نہ سلاسل خالی
ایک میرے قتل سے دو لطف لے قاتل ہوئے
زنگ دل تیرا مٹا جو سر کھلے شمشیر کے
ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی
ہم شاعروں کا حلقہ حلقہ ہے عارفوں کا
نا آشنائے معنی صورت نہیں ہے کوئی
جان سے عزیز دل کو رکھتا ہوں آدمی ہوں
کیونکر کہوں میں مجھ کو حسرت نہیں ہے کوئی
شہر بتاں ہے آتش اللہ کو کر دیا د
کس کو پکارتے ہو حضرت نہیں ہے کوئی
مجھ کو حیرت ہے حسینوں سے بچی ہے کیونکر
بادشاہوں کے لیے، چین جبیں تھوڑی سی
اے جنوں تنگ نہ ہو وسعت کونین کو دیکھ
یہی تھوڑی سی جگہ ہے نہ وہاں تھوڑی سی

مدت العمر ہے اک چشم زدن کا وقفہ
کرلیں ہو حق یہ خرابات نشیں تھوڑی سی
کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے
راز دل افشانہ ہو اے دل کئی رکھتا ہوں میں
پھوڑ ڈالی آنکھ اگر آنسو نظر آیا۔ مجھے
آنکھ آئینہ سے تم نے جو لڑائی ہوتی
رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
شرم تجھ کو بہت اسے آئینہ رو آتی ہے
میری صورت سے مگر عشق کی بو آتی ہے
صبح تک دیدۂ تر سے نہیں آنسو تھمتے
پانی کرنے کو شب ہجر لہو آتی ہے
موسم گل کی ہوا نے کیے ساقی بیکار
بط مے اوڑھ کے لب مست کو چھو آتی ہے
فصل گل باقی ہے کر لوں گا گریباں پھر چاک
آئے دو سوزن اگر بہر رفو آتی ہے

جلد دوم

صلا۲ غرورِ حسن نے نازاں کیا انھیں ورنہ
نیاز نامہ مشرّف جواب سے ہوتا
نہ پوچھ علم محبت سے کیا کھلا تجھ کو
یقیں ہُوا وہ کہ جس کا نہ تھا گماں ہوتا
گلوں سے نالۂ بلبل کی وجہ کیا پوچھوں
زباں کا ورد نہیں گوش سے بیاں ہوتا
نیازمند نہ ہوتا تو پوچھتا ہوں میں
یہ ناز آپ جو کرتے ہیں پھر کہاں ہوتا
دولتِ فقر سے رکھتا ہے غنی ہم کو آتشِ دلِ خرسند اپنا
ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر
مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا
حسن و جمال نور جو اسلام کا دکھائے
دیوانۂ پری ہو مقیّد نماز کا
صلا۲ ہر چند حالتِ دل ناگفتنی تھی لیکن
روکر کہا کچھ اُس سے جو اہلِ درد پایا
لبوں تک آئی ہوئی بات پی گئے سو بار
زباں کو دل نے نہ اذنِ بیانِ حال دیا
فسانۂ رخِ رنگین یار کیا کہتے
چمن کو آگ لگاتا جو باغباں سنتا

رسائی دیر میں ہوتی جو برہمن کی طرح
بُتوں کو چھیڑ کے دو چار گالیاں سُنتا

اللہ کے سوا نہ کسی نے کبھی سُنا نالہ مرا غریب کی فریاد ہو گیا

خوبصورت یوں تو بہتیرے تھے لیکن پارسا
نازنیں نازک بدن نازک کمر کوئی نہ تھا

کرتا ہوں جو میں حسرتِ پرواز میں نالے
صیّاد کو غم ہے مری بے بال و پری کا

شرطِ وفا کی کس نے وفا ہے آتش سا عارف آگاہ بھولا

شاعروں میں کوئی آتش سا نہ ہو گا حسن دوست
خوبصورت پر پڑی جب آنکھ مائل ہو گیا

پر تو کترے ہیں یقیں ہے کہ چھری بھی پھیرے
زمزموں سے میرے صیّاد ہے جل جل جاتا

زخم کاری کی تیری تیغ سے اللہ رے خوشی
رقص کرتا ہوا دنیا سے ہے بسمل جاتا

کھل جائیں تجھے معنی توحید اگر آتش
پھر دیکھیں تو دکھلائیں گل و خار عجب روپ

آتش یہ شاعروں کا فقط اختراع ہے
رخسار ہیں نہ گنج نہ گیسوئے یار گنج

جلا دیں دل نہ کیونکر شعر آتش
صفا بندش سے ہے معنے خوبصورت

لب شیریں تک اُن کے آئی بات
بن گئی قند کی مٹھائی بات

دامن اس گل کا کیا چھوٹے گی صبا
یہ کسی نے ہے جھوٹ اُڑائی بات
نہ کسی کو کڑی کہی ہم نے
نہ کسی کی کڑی اُٹھائی بات
درد دل کہنے میں ہے کیا پس وپیش
کہی جاتی ہے منہ تک آئی بات
تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سُنائی نئی سُنائی بات
کہہ گئے تم کنایہ میں کیا کیا
نہ کسی نے تمھاری پائی بات
تیرے شیریں کلام کو سُن کر
پھر نہ آتش کسی کی بھائی بات

۲۳۶ دکھائے حسن کی اپنے جسے کہ یار بہار
یہ عشق ہو کہ پکارا کرے بہار بہار
باؤ کے جھونکے کے لگنے سے ہیں میلے ہوتے
نازکی ختم ہے ان پھول سے رخساروں پر
موسم گل میں جو ہوتا ہے زیادہ سودا
دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیواروں پر
سُن جو پائی ہیں تری ابر سیہ سی زلفیں
رقص طاؤس کیا کرتے ہیں کہساروں پر
کر رہی ہے شب ہجراں کی سیاہی اندھیر
چاند پر ہے نہ وہ رونق نہ چمک تاروں پر

دل صید گہ عشق میں کب سے ہے نشانہ
للہ اُڑا دے اسے کوئی قدر انداز

ایک سے ایک ہے تماشا رنگ   دیدنی ہے جہاں رنگا رنگ
سامنے تیرے روئے رنگیں کے   لالہ و گل نے بھی نہ پکڑا رنگ
آنکھیں ہیں اور زلفِ یار کا دھیان   کچھ نہ کچھ لائے گا یہ سودا رنگ
تم جو حمام میں نہیں آئے   مٹے گلرنگ کا ہے پتلا رنگ
فکرِ رنگیں نے تیرے اے آتش   کیسے کیسے کیے ہیں پیدا رنگ

محبت کوڑیوں کے ہو اگر مول   بنی آدم نہ لے یہ درد سر مول
بہادر تیغ چہرے پر ہیں کھاتے   کرے کالا جو منہ وہ لے سپر مول
اُٹھائی آنکھ تم نے مر گئے ہم   ہماری جان کی تھی اک نظر مول

شب کو جاتا ہوں تو منہ پھیر کے یہ کہتے ہیں
نیند آئی ہے ہمیں آپ بھی آرام کریں
آتش آغاز محبت کا ہو انجام بخیر
خاک پر تیری قدم رنجہ گل اندام کریں

ص ۲۴۲ متصل عاشق روانہ ہوتے ہیں سوئے عدم
ہاتھ رکھے پھرتے ہیں وہ بھی کمر پر ان دنوں
موم آہن کرتے تھے یا دل پگھل سکتا نہیں
آہ کیا پتھر پڑے تیرے اثر پر ان دنوں
کون فصلِ گل میں اے آتش نہیں پیتا شراب
بھیڑ سی ہے بھیڑ مے خانے کے در پر ان دنوں)

سنا ہے عاشقوں سے برق وش بھی نام جو اپنا
تماشا دیکھتے ہیں وہ لگا کر آگ خرمن میں

عذاب گور کا واں سامنا یاں رنج دنیا کا
نہ گھر میں چین زندوں کو نہ مردوں کو ہے مدفن میں

جب جوش جنوں نے ہمیں گھر ہی سے نکالا
پھر سایۂ دیوار سے کیا کام ہے ہم کو

مرتا ہوں جو کہتا ہوں تو کہتے ہیں وہ ہنس کر
عیسیٰ نہیں بیمار سے کیا کام ہے ہم کو

پوچھی کسی نے محکمۂ حشر میں نہ بات   ٹھہرے نہ ہم حساب میں روز شمار کچھ

بولی یہ روح پھینک کے پشتارہ جسم کا
بھاری ہے بوجھ کون یہ بیگار لے چلے

آتش جرس کے نالوں کی پھر ہو نہ احتیاج   ۲۴۴
ہم کو جو ساتھ قافلہ سالار لے چلے

مشکل ہے

ہمارا دعوی باطل کیا کریں یا رب
بتوں کی تیری طرح سے خدائی مشکل ہے

پھرایا سر کو ترے زمزموں نے اے بلبل
خفا نہ ہو تو کہوں خوشنوائی مشکل ہے

بہت سی دیکھی ہیں خمدار ہم نے تلواریں
تمہاری ابروؤں کی کج ادائی مشکل ہے

وہ اتحاد نہیں ہے کہ جس میں فرق پڑے
ہماری اور تمہاری جدائی مشکل ہے

ولایتی بھی حسینوں کو ہم نے دیکھ لیا
منش تری سی کہاں میرزائی مشکل ہے

پھریں گے ہم نہ ہزار آپ ہم سے مُنہ پھیریں
تمھیں ہے سہل ہمیں بے وفائی مشکل ہے

جلا کیا کریں آئینہ ساز آئینے
صفائے رُخ کی تمھاری صفائی مشکل ہے

خلیلؑ کا اسے کعبہ نہ جانیو آتش
خدا کا گھر ہے یہ دل تک رسائی مشکل ہے

وردِ زباں جناب محمد کا نام ہے
قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے

مومن پسند یار کا شیریں کلام ہے
کیا چاشنی ہے کیا مزہ ہے کیا قوام ہے

۲۴۵ھ

ہم چشم تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصّہ تمام ہے

بے معنی ہے وہ عشق کہ جس میں کشش نہیں
دلچسپ ہو نہ حسن تو صورت حرام ہے

آتش بُرا نہ مانیو حق حق جو پوچھیے
شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

دل بہت تنگ رہا کرتا ہے — رنگ بے رنگ رہا کرتا ہے
صلح کی دل سے ہیں یہاں مصلحتیں — واں سر جنگ رہا کرتا ہے
گفتنی حال نہیں ہے اپنا — کچھ عجب ڈھنگ رہا کرتا ہے

عالم وجد تیرے مستوں کو بے دف و چنگ رہا کرتا ہے
بندش چست سے تیرے آتش قافیہ تنگ رہا کرتا ہے

۲۴۷ خال مشکیں کو ترے کرتے ہیں فتنے سجدے
عنبریں گیسوؤں کے گرد بلا پھرتی ہے
خاک چھنوا رہی ہے کوچۂ قاتل کی تلاش
ساتھ ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے
پاؤں تک یار کے پہنچے گی لٹک کر سر سے
پھیرنے سے کوئی وہ زلف رسا پھرتی ہے
چلے گا کبک کیا طوطی کرے گا کیا سخن سازی
تری گفتار بہتر ہے تری رفتار بہتر ہے
عناب لب اپنے کا مزہ کچھ نہ پوچھیے
کس درد کی ہیں آپ دوا کچھ نہ پوچھیے
خوشبو سے ہو رہا ہے معطر دماغ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھیے
اللہ نے کیا ہے کسے بادشاہ حسن
سر پر ہے کس کے ظل ہما کچھ نہ پوچھیے
ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھیے
کیا کھا کے زخم کرتے ہیں مستوں کی طرح رقص
بسمل تمھاری تیغ کے کس کس نشانا سے
لکھے گئے بیاضوں میں اشعار انتخاب
رائج رہے وہی کہ جو سکے کھرے ہوئے

آتش خدا نے چاہا تو دریائے عشق میں
کود ے جواب کی ہم تو ورے سے پرے ہوئے

کہتے ہیں، ذکر لیلیٰ و مجنوں جو چھیڑ دیے
جب رہیے بس نہ گور کے مردے اکھیڑ لیے

خوش حال ہیں مثل کے بچے ہنت آسماں
یوسف کو کھا کے ہو گئے ہیں شیر بھیڑیے

ساقی ہے مے ہے یار ہے بزم نشاط ہے
چھیڑے جواب نہ ساز تو مطرب کو چھیڑ دیے

آتش قمار عشق میں تیرے حضور یار!
جاؤں کو اپنی بھول گئے ہیں بکھیر لیے

ص ۲۵۰ جہاں سے حسرت منزل کا داغ لے کے گیا
تمہاری راہ میں جان اک شکستہ پا نے دی

با علی کہہ کر بت پندار توڑا چاہیے
نفس امارہ کی گردن کو مروڑا چاہیے

زلف کے سودے کو اپنے سر کو پھوڑا چاہیے
جب بلا کا سامنا ہو منہ نہ موڑا چاہیے

پیر ہو آتش کفن کا سامنا ہے عنقریب
تو بہ کیجے دامن تر کو نچوڑا چاہیے

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

ص ۲۵۱ خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گذری
جو اشک آنکھوں سے آتا ہے سو بیتابانہ آتا ہے

زیارت ہوگی کعبے کی یہی تعبیر ہے اس کی
کئی شب سے ہماری خواب میں بت خانہ آتا ہے

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلّٰی اٹھائیے

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے
تمھارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلک قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

چپ ہو کیوں کچھ منہ سے فرماؤ خدا کے واسطے
آدمی سے مجسم نہ بن جاؤ خدا کے واسطے

چلا وہ راہ جو ہر ایک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

بہار گل میں ہیں دیوانے جامے سے باہر
پری کا بھیس ہے بدلے ہوئے بلا آئی

لیا جو بوسہ تو ہنس کر یہ اس صنم نے کہا
خدا سے شرم نہ اے بندۂ خدا آئی

نہ روز حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

کشش عشق میں بارے اثر اتنا تو ہوا
پھر کھڑے ہوتے ہیں منہ پھیر کے چلنے والے
ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
گر بھی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے
گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے
۲۹۸ سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسائش
عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے
نہ بیٹھیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے
تلاش یار میں کیا ڈھونڈیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا
ہزار راہزن امیدوار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

بہت سی ٹھوکریں کھلوائے گا یہ حسن ان کا
بتوں کا عشق نہیں کوہسار راہ میں ہے
بلائے جان مسافر ہے خواب شیریں بھی
یہی وہ شہد ہے جو زہر مار راہ میں ہے
چلا ہے تیر و کمان لے کے صیدگاہ وہ ترک
خوش نصیب وہ جو جو شکار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل خراب راہ میں ہے

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے
ہوائے گل میں ہم کس وادی پر خار میں آئے
اٹھانے بار عشق اس عالم غدار میں آئے
کہاں سے ہم کہاں پھرتے ہوئے بیگار میں آئے
کمندوں سے نہیں مشتبہ زنار کے حلقے
پھنسے وہ جو فریب کافر و دیندار میں آئے

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجیے
موسم گل میں جو ہوں بے چاک سے
میرے دیوانوں سے بننے کی نہیں
آگ کی پریاں ہیں انسان خاک کے

از کلیات آتش طبع نول کشور پریس کانپور ۱۸۷۳ء

واسوختِ آتش

آگے اک یار نہ تھا یار تیرے یار تھے ہم
ہمدم و ہم سخن و مونس و غمخوار تھے ہم
لطف و اشفاق و عنایت کے سزاوار تھے ہم
مدعی اب جو ہیں مجبور تھے مختار تھے ہم
چیں جبیں پر نہ تھی رنجش کی نہ یہ باتیں تھیں
مہربانی تھی شب روز ملاقاتیں تھیں

انس تھا ہم سے تمھیں ہم تھے تمھارے مائل
عشق تھا حسن خداداد سے ہم کو کامل
غم و اندوہ و جدائی سے نہ واقف تھا دل
باغ عالم میں مرادیں تھیں ہماری حاصل
سرو قد قمری بے صبر و تحمل ہم تھے
گل تمھارا رخ گلرنگ تھا بلبل ہم تھے

گوش زد یار تیرے نام نہ تھا غیروں کا
لانے پاتا کوئی پیغام نہ تھا غیروں کا
خلوت بزم میں کچھ کام نہ تھا غیروں کا
گرد حلقہ سحروشام نہ تھا غیروں کا
دامن پاک سے گرد نجس آگاہ نہ تھی
کوچہ گردوں کو طبیعت میں تیری راہ نہ تھی

دلبری اپنی تجھے رہتی تھی منظور اے دوست
ایک دم آنکھوں سے ہم ہوتے نہ تھے دور اے دوست
دشمن اس طرح سے پھرتے نہ تھے مغرور اے دوست
جو خدا چاہے کرے بندہ ہے مجبور اے دوست
پاس ہوتے ہیں وہ جو دور پڑے رہتے تھے
بیٹھتے ہیں وہ برابر جو کھڑے رہتے تھے
گفتگو چھیڑ کے کرتے ہو سخن سازوں سے
پھر دن سرگوشی رہا کرتی ہے غمازوں سے
حال دل کا ہے بیاں تم تو انداز وں سے
صحبت اب آن رہی ہے خلل انداز وں سے
فرق آیا حرکاتوں میں خدا خیر کرے
تہ نکلنے لگی باتوں میں خدا خیر کرے
جو کڑی کہتے تھے ہم تم پہ اسے سہتے تھے
سخت کہتے تھے تو سن کر اسے چپ رہتے تھے
رونے لگتے تھے نہ یوں پھوٹ نہ یوں بہتے تھے
اس مروت پہ تمہارے یہی ہم کہتے تھے
اس پہ قربان رہیں گے اسے چاہیں گے ہم
منہ سے نکلا ہے جو کچھ اس کو نباہیں گے ہم
کوئی آسکتا نہ تھا اپنے سوا صحبت میں!
دوسرے کو نہ رسائی تھی تیری خدمت میں
مختصر قصہ ہمیں ہم تھے ہر اک حالت میں
انجمن میں ہمیں ہوتے تھے ہمیں خلوت میں

مصحف رُخ کو سمجھتا نہ تھا ایماں کوئی
خال ہندو کا نہ عاشق تھا مسلماں کوئی
کیسی تدبیر تمھاری ہے یہ کیسی تجویز
نہ رہی آپ کو ہرگز کس و ناکس کی تمیز
چیز ایک اُن کو سمجھنے لگے جو تھے ناچیز
ہم سے دیکھا نہیں جاتا ہے ذلیلوں کو عزیز
ان سے نیکی کرو ممنون جو بدافعال نہ ہوں
لوٹیں وہ دولتِ دیدار جو کچھ مال نہ ہوں
عیش باغ آپ کبھی سیر کو جو جاتے تھے
خار ہوتا تھا جو بندے کو نہ واں پاتے تھے
غنچہ ساں تیری جدائی سے نہ تنگ آتے تھے
بھیج کر پیک صبا ڈھونڈ کے بلواتے تھے
ہر روش پر مجھے تم ساتھ لیے پھرتے تھے
ہاتھ میں اپنے میرا ہاتھ لیے پھرتے تھے
شاذ تھا رنج میری جان کدورت نادر
حال پر اپنے توجہ تھی تمھاری ظاہر
کبھی خدمت میں جو ہوتے نہ تھے بندے حاضر
منتیں مانتے پھرتے تھے ہماری خاطر
روشنی مسجدوں میں جا کے کیا کرتے تھے
چلّے درگاہوں میں دن رات بندھا کرتے تھے
روز و شب وہ جو رہا کرتی تھی صحبت نہ رہی
ہمنشینی کی جو خدمت تھی وہ خدمت نہ رہی

قصہ کوتاہ، وہ مہر و محبت نہ رہی
مُنہ دکھانے کو ہمارے کوئی صورت نہ رہی

التماس اتنا تو رکھتے ہیں تیری ذات سے ہم
پھر گیا تو، مگر اپنی نہ پھرے بات سے ہم

اُٹھ گیا مہر و محبت کا زمانے سے رواج
بیٹھے بیٹھے اس الجھ پڑنے کا کیا کیجے علاج

یوں تو معشوقوں کا ہوتا ہے تلوّن کا مزاج
پر نہ اتنا بھی کہ کل تھی سو طبیعت نہیں آج

یا ہمیں ساتھ رہا کرتے تھے اندر باہر
یا ہمیں ہیں کہ ہمیں حکم ہے باہر باہر

گر یہی طرز ہیں صاحب کے یہی ہیں انداز
ہم نے بھی عہد کیا دل سے بس اے بندہ نواز

نہ کریں گھر کی طرف تیرے کبھی روئے نیاز
اس طرف کعبہ بھی ہوئے تو کریں ترک نماز

واں نکل جاویں جہاں کا نہ پتہ ملتا ہو
نہ ملیں، ملنے سے تیرے جو خدا ملتا ہو

جلنِ جاں، دل کا جلانا نہ تمھیں آتا تھا
بگڑی صورت کا بنانا نہ تمھیں آتا تھا

خندہ زن ہو کے رُلانا نہ تمھیں آتا تھا
مُنہ کو دکھلا کے چھپانا نہ تمھیں آتا تھا

گرہ ابرو میں نہ تھی کاکل پیچاں کی طرح
زلفوں کا رُخ نہ پھرا رہتا تھا مژگاں کی طرح

خود فروشی کے معتقد تھے نہ خود کامی کے
پختہ کامی کے چلن چلتے نہ تھے خامی کے
ہونٹ سلواتے تھے دم بازوں کے پیغامی کے
ننگ آتا تھا تمھیں نام سے بدنامی کے

پری و حور سے بھی حسن میں مغرور تھے تم
پاس تم کو نہ کسی کا تھا بہت دور رہتے تم
سرمہ دیتے تھے تو آنکھوں کو چراتے تھے تم
پان کھاتے تھے تو منہ کو نہ دکھلاتے تھے تم
مہندی ملتے تھے تو ہاتھوں کو چھپاتے تھے تم
پاؤں خلخال پہن کر نہ ہلاتے تھے تم

قتل سے عاشق صادق کے وفا مانع تھی
خون ناحق سے تمھیں شرم و حیا مانع تھی
جو خوشی خاطر نازک کی نہیں اس کا غم
کھائیے ترک محبت کی جو کھانا ہے قسم
رہ نہیں سکنے کے بے شغل ہی کہتے ہیں ہم
ڈھونڈ لیں گے کوئی زیبا صنم عیسیٰ دم
عشق بازی کا نہ بھولیں گے مزا یاد رہے
دل لگائیں گے "فرنگی محل" آباد رہے

یہ غلط فہمی ہے، ہم سا کوئی محبوب نہیں
کیا کوئی اور زمانے میں خوش اسلوب نہیں
راست بازوں سے یہ ابرو کی کجی خوب نہیں
نہ سہی دوستی صاحب کو جو مطلوب نہیں

تم کو غیروں کی مدارات مبارک ہووے
ہم کو جس سے ہے ملاقات مبارک ہووے
ایسا شاہد ہے اب اللہ سے ہم کو مقصود
آشنائی جسے مقبول ہو رنجش مردود
سامنے اپنے تجھے کچھ نہ وہ سمجھے موجود
رخ گلرنگ جو دکھلائے تو بھیجے تو درود
نرگسی چشم کا حیرت سے تماشائی ہو
سنبلیں زلف کی بو سونگھ کے سودائی ہو
خوں کرے دل کو تمہارے رگ جاں سے وہ کمر
حلقۂ ناف کی تنگی سے رہو تنگ اکثر
ہاتھ ملنے پھر و پڑ جائے جو پاؤں پہ نظر
چھٹتے ہاتھ آئیں تو گل کھایا کرو چھاتی پر
لب دیکھے تو سر پیٹے بہت ننگ سے تو
ہونٹ چاٹا کرے نام دہن تنگ سے تو
خوبی گوش کرے اپنا تمہیں حلقہ بگوش
پھول ہی رکھے وہ گردن کی صراحی کا گوش
دیکھ کر آئینہ ساں سینہ ہو حیرت سے خموش
حسن میں اس کے غرض ہو نہ سکے دوش بدوش
نقش دل پر تیرے نقش در زنداں سے رہے
خار خار آٹھ پہر کاوش مژگاں سے رہے

مُقرّ اس کا ہووہ الزام تجھے جو جو دے
عرق شرم سے رخسار و جبیں دھو دھووے
خندہ زن ہو کے حقیقت کو تیری کھو کھو دے
آگے اُس گل کے تو شبنم کی طرح رو رو دے
طعن و تشنیع وہی مہر لقا تجکو کرے
صورت ماہ نو انگشت نما تجکو کرے

طنز آمیز کلامات سے آگاہ کردوں
چھیڑ کر باتیں بتاؤں اُسے تجھ سے مجھوں
اس کی زلفوں کی طرح کان تک اس کے پہنچوں
جو فرشتہ سے نہ پہوچی ہو سو اس کے پہوچوں
دل جلادے وہ تیرا تجھ سے بگڑ چل نہ سکے
تجھ سے چل نکلے وہ، تو اس سے نکل ہی نہ سکے
راہ پر لاؤں اسے راہ بتاؤں تجھ کو
لب بہ لب اس سے رہوں مُنہ نہ لگاؤں تجھ کو
تنگ آغوش میں لوں اور دکھاؤں تجھ کو
جس طرح تو نے جلایا ہے جلاؤں تجھ کو
شاداں خاطر نازک ہو تجھے غم ہووے
میرے گھر عید ترے گھر میں محرّم ہووے
گفتگو تُنے لیے تھی یہ شکایت انگیز
یاری غیر سے تا آپ کرو تم پرہیز
نقص بیجا ئے لیے میرے لکھو دستاویز
متوجہ ہو ادھر کو نگہ لطف آمیز

پھر پری ہو وہی، تم اور وہی دیوانے ہم
پھر وہی شمع ہو تم اور وہی پروانے ہم
غیر معشوق کا نکلا ہے زباں سے جو نام
چھیڑنے کے لیے صاحب کے فقط تھا یہ کلام
حرفِ حق کہہ کے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام
مت برا مانیو اس بات کا آتش ہے غلام
دوستی غیر سے واللہ جو منظور بھی ہو
آنکھ اٹھا کر نہ کبھی دیکھیں اگر حور بھی ہو